بلوچی عشقیہ شاعری

گل خان نصیر

بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

Scanned with CamScanner

E-3 61

بلوچی عشقیہ شاعری

گل خان نصیر

بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

Scanned with CamScanner

جملہ حقوق بحق بلوچی اکیڈمی کوئٹہ محفوظ

بار اوّل ——— اکتوبر ۱۹۷۹ء

تعداد ——— ایک ہزار

پرنٹر ——— قلات پرنٹنگ پریس کوئٹہ

پبلشر ——— بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

گرافک ——— اے ایس ممتاز

قیمت ——— ۲۵ روپے 120

تعارُف

میر گل خان نصیر شعروادب کے جس بلند مقام پر فائز ہیں، اس کی موجودگی میں مجھ ناچیز کی طرف سے اُن کا "تعارف" لکھنا سورج کو چراغ دکھانے والی بات ہے، لیکن چونکہ بلوچی اکیڈیمی کی طرف سے قائم کردہ روایت کے مُطابق اِس فرض کی انجام دہی ضروری ہے اور قرعۂ فال اکثر و بیشتر خصوصیت سے میر گل خان نصیر کے بارے میں قریبی مراسم ہونے کے باعث میرے ہی نام نکلتا ہے اس لئے زیر نظر تصنیف کا "تعارف" لکھنے کا شرف بھی مجھے حاصل ہُوا ہے۔

یُوں تو میر گل خان نصیر بلوچی اور اُردو کی متعدد تصانیف کے مصنف ہیں، مگر بلوچی اکیڈیمی اُردو میں اُن کی یہ تیسری تصنیف پیش کر رہی ہے۔ اس سے پہلے "بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی" اور "بلوچی رزمیہ شاعری" چھپ کر قبولِ عام حاصل کر چکی ہے۔ لیکن میری ذاتی رائے میں زیر نظر تصنیف سابقہ تصانیف پر اس لئے فضیلت کی حامل ہے کہ اس میں مصنف نے زیادہ غور و فکر اور فنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ موضوعات کے انتخاب و ترتیب کے علاوہ بلوچی اشعار کا ترجمہ جس حسین و دلکش پیرائے میں کیا گیا ہے اور اُن کی تشریح جس خلاقانہ انداز میں کی گئی ہے، اس کا تقابل سابقہ تصانیف سے نہیں

Scanned with CamScanner

کیا جا سکتا۔ اشعار سے متعلقہ موضوعات کی تشریح کے علاوہ اصل اشعار کا اُردو ترجمہ جس ذوق و وجدان کے عالم میں کیا گیا ہے، بلوچی اور اردو زبانوں کے مزاج کی عدم ہم آہنگی کے باوجود یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشعار بلوچی میں نہیں بلکہ اردو ہی میں تخلیق کئے گئے ہوں۔

اس تصنیف میں مصنف کا سیاسی روپ بالکل دھندلایا ہوا اور ہجر و وصال کے درد و لذت آشنا فن کار کا زندہ پیکر معلوم ہوتے ہیں۔ اُمید ہے مصنف کی اس پیشکش کو بھی اسی طرح پذیرائی بخشی جائے گی جیسی کہ سابقہ تصانیف کو بخشی گئی ہے۔

۱۵ ستمبر ۱۹۷۹ء

محمد پناہ وائس چیئرمین
بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

عرضِ حال

بنام خداوند جان آفریں
حکیم سخن بر زبان آفریں

———————— (سعدی)

نازک مزاج حکمرانوں کی ناراضگی اور غضب کا شکار ہو کر پچھلے چار سال سے قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہا ہوں۔ تین سال بلوچستان کے سنٹرل جیل مچھ میں بسر کئے۔ اب پچھلے سال سے سنٹرل جیل، حیدر آباد میں پڑا ہوں۔ پانچواں سال جا رہا ہے لیکن قفس سے رہائی پانے کی کوئی صورت اب تک نظر نہیں آتی۔

آج کل حیدر آباد سنٹرل جیل سابق پاکستان نیشنل عوامی پارٹی کے لیڈروں اور کارکنوں سے آباد ہے۔ راقم سمیت کل پچپن نفر سازش کیس میں ملوث ہیں۔ پورا ایک سال ہو چکا ہے کہ ہمیں سنٹرل جیل حیدر آباد میں جمع کیا گیا ہے، ابھی عدالتی کارروائی کی صرف ابتدا ہوئی ہے، مقدمہ تکمیل کو کب پہنچے گا اور کب ہمیں اپنی قسمتوں کا فیصلہ سنایا جائے گا؟ یہ بہت دور کی بات ہے، ممکن ہے اس میں کئی برس اور لگ جائیں۔

جیل سے باہر کی دنیا میں شاعر اور ادیب، فرصت کی جن چند گھڑیوں کے لئے ترستے ہیں یہاں پر زندوں کے اس گورستان میں، بکثرت حاصل ہیں۔ رات ہو کہ دن، صبح ہو کہ شام،

Scanned with CamScanner

آدھی رات کا سماں ہو کہ دوپہر کی کڑکتی دھوپ، جب بھی جی چاہے اُٹھیں، بیٹھیں یا گھوڑے بیچ کر
سو جائیں کوئی امر مانع نہیں، کوئی پوچھنے والا نہیں۔ چودہ بارہ فٹ کی ایک کھولی کی جملہ کائنات
آپ کے سپرد ہے ۔

گوشے میں قفس کے ہمیں آرام بہت ہے

اگر لکھنے پڑھنے میں تھوڑی سی دلچسپی ہو اور مطلوبہ کتابیں دستیاب ہو سکیں تو قید و بند
یہ تلخ ترین ایام بھی بڑی ہنسی خوشی گزارے جا سکتے ہیں۔ وقت کی بہتات سے خاطر خواہ استفا
کیا جا سکتا ہے اور زندگی کے احساس زیاں کو بھلایا جا سکتا ہے۔

سنٹرل جیل مچھ میں ایک ... رہنے ہمیں نوشت و خواند کی زیادہ سہولت حاصل تھی ج
کتاب کی ضرورت پڑتی، فوراً قریب ہونے کی وجہ سے اور اپنے عزیزوں خویش و اقارب
دوست و احباب سے ملاقاتوں میں آسانی کے سبب جلد مل جاتی تھی لیکن یہاں حیدرآباد
آسانیاں میسر نہیں۔ اس لئے تصنیف و تالیف کا کام خاطر خواہ طور پر نہیں ہو سکتا۔ مگر
زندہ رہنا اور کام کرنا ہے اور اسی زندہ رہنے کی تڑپ نے ہی ہمیں زندان کی اس کال کو
آباد کرنے کی جرأت دی ہے اس لئے، ہم سیاسی کارکنوں کے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے ک
یہی زندگی کو جلا بخشنے اور کار آمد بنانے کے لئے کوئی کام کریں تاکہ ہمارا وقت ضائع نہ جائے
مصروف رہیں تاکہ سستی اور کاہلی ہم پر غلبہ نہ پانے اور ہمارا مسلک نظروں سے اوجھل
اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی آئندہ نسلوں کے لئے کچھ ایسے آثار چھوڑ جائیں جو قوم او
مفید ہوں اور جن سے استفادہ کیا جا سکے۔

ہمارے سیاسی رہنماؤں کو یقیناً اپنے فرائض کا احساس ہے اور وہ اپنے طور پر ک
میں لیکن ہم شاعروں اور ادیبوں کا بھی فرض ہے کہ جو علمی و ادبی کام اُن کے کرنے کے نہیں
فرض سمجھ کر سر انجام دیں تاکہ ہمارے سیاسی رہنماؤں پر کام کا زیادہ بوجھ نہ پڑے

Scanned with CamScanner

میں کوئی نامی گرامی شاعر یا ادیب نہیں ہوں، بس اتنا ہے کہ تذکیر و تانیث سے مُبرّا اُردو کے چند جملے لکھ سکتا ہوں اور بلوچی میں شعر کہنے کی مشق رکھتا ہوں۔ یہ بھی میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے بلوچی کے اشعار کوئی بلند پایہ رکھتے ہیں البتہ، اتنا ضرور جانتا ہوں کہ بلوچ عوام اور میرے دوست احباب کو پسند آتے ہیں، اس سے میری ہمت افزائی ہوتی ہے اور مجھ میں حوادثِ دوران سے ٹکر لینے کا حوصلہ پیدا ہوتا رہتا ہے۔ بہرحال اپنی بے بضاعتی اور کوتاہیوں کے باوجود آج جو میں اُردو میں اور وہ بھی بلوچی شاعری سے متعلق لکھنے کی جرأت کرتا ہوں اس کی خاص وجوہ بھی ہیں جو اُوپر بیان کر چکا ہوں البتہ، ایک بات اور بھی ہے جس کی وضاحت ضروری ہے۔

بلوچ من حیث القوم بے وسیلہ اور غریب ہے۔ اس دُنیائے خیر و شر میں اُس کا پُرسان حال اب تک کوئی نہیں اور نہ ہی کوئی اُس سے ہمدردی رکھتا ہے بلکہ اس کے برعکس کئی بھیڑیے اس کی بوٹیاں نوچنے اور اُسے ہڑپ کر لینے کو دندانِ آز تیز کئے ہوئے تاک میں بیٹھے ہیں۔ ان حالات سے عہدہ برآ ہونے کی دو ہی صورتیں ہیں اوّل، یہ کہ ہم بلوچ تن بتقدیر ہو کر بیٹھے رہیں کیونکہ جو کچھ ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا ہم اُس کا غم کیوں کھائیں۔ دوم یہ کہ ہم کمر ہمت باندھ کر اُٹھیں اور اپنے بچاؤ کے لئے جو کچھ ہم سے ممکن ہو سکتا ہے کر گذریں۔ ہم نے جس طرح سیاست کے میدان میں، اُسی طرح شعر و ادب کے معاملے میں بھی، یہ دُوسرا راستہ اپنے لئے پسند کیا ہے۔ ہماری صحیح نہیں ہو گی تو کیا ہو گا۔ اہلِ زبان کو ہماری تحریریں پسند نہیں آئیں گی۔ نہ سہی مطلب تو کم از کم اُن کی سمجھ میں آجائے گا۔ ہماری تاریخ اور شعر و ادب کے چند موٹے موٹے نقوش تو اُن کے زبان میں اُبھر آئیں گے جن سے ممکن ہے کہ ان میں تجسس کا جذبہ بیدار ہو اور، وہ ہم سے اور ہمارے ملی و ادبی سرمایہ سے دلچسپی لینا شروع کر دیں اور ہمیں محض "راپچی" یا تیسرے درجے کے شہری سمجھنے کا اپنا متکبرانہ انداز بدل دیں اور شاید ان کا ضمیر اُنہیں یہ احساس بھی دلا دے کہ، یہ شتربان گلہ بان جن کو ہم جاہل اور اُجڈ گنوار سمجھ کر اب تک ٹھکراتے رہے ہیں واقعی، اپنی ایک جداگانہ تہذیب و تمدن، معاشرہ، تاریخ اور ایک فصیح و بلیغ اور قدیم زبان رکھتے ہیں جو ہر لحاظ سے

۱؎ خدمت گذار

شاعرانہ اظہارِ خیال کو اپنے دامن میں سمیٹنے کی صلاحیت اور وسعت رکھتی ہے۔

علاوہ ازیں جب ہم اُردو اہلِ زبان کی بات کرتے ہیں تو بھی ہم کسی ٹھوس حقیقت کی طرف
اشارہ نہیں کر پاتے کیونکہ، پاکستان میں اُردو کے اہلِ زبان تو صرف گنتی کے چند لاکھ وہ لوگ ہیں جو
تقسیمِ ہند کے بعد ہندوستان کے اُردو بولنے والے علاقوں سے ہجرت کر کے یہاں آتے ہیں اور
اب اُن کی زبان بھی فصیح نہیں رہی۔ اُن کے بچے ابھی سے "کرتا پڑا ہے" اور "جاتا پڑا ہے" جیسی ٹھیٹھ
کراچی باسیوں کی زبان بولنے لگے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ سندھ، پنجاب، سرحدی صوبہ اور بلوچستان
کے لوگ جو اُردو بولتے ہیں آگے چل کر یہی اصل اُردو اور پاکستان کی قومی زبان بنے گی۔ ایک
زبان بولنے والے دو ملکوں کی زبانوں میں فرق ہونا عام مشاہدے کی بات ہے۔ افغانستان
کی فارسی، ایران کی فارسی اور بلوچستان کی فارسی کئی لحاظ سے مختلف ہیں۔ امریکہ میں جو انگریزی
عام بولی جاتی ہے اس میں اور انگلستان کی انگریزی میں نمایاں فرق ہے۔ اس لحاظ سے جو اُردو
ہندوستان میں بولی جاتی تھی یا اب بولی جاتی ہے اُس میں اور ہماری پاکستانی اُردو میں اگر فرق
ہو تو عیب کی بات نہیں بلکہ ایک لحاظ سے ہمارے جداگانہ وجود کو ثابت کرنے کے حق میں
بہر حال، ہماری غرض آم کھانا ہے پیڑ گننا نہیں۔ جو اُردو ہمیں آتی ہے اور الفاظ کا جو تلفظ
کر سکتے ہیں اُسے ہی صحیح سمجھ کر ہمیں آگے قدم بڑھانا چاہیے۔

اپنی اِس سوچ کو، جس کا اُوپر ذکر کر چکا ہوں زیرِ عمل لا کر میں نے بلوچی شاعری پر اُردو
لکھنے کے لیے قلم اُٹھایا ہے۔ کتاب کا پہلا حصّہ "بلوچی کی رزمیہ شاعری" کے نام سے پیش
مکمل کر چکا ہوں اور دوسرا حصّہ اب "بلوچی کی عشقیہ شاعری" کے نام سے حیدر آباد سنٹرل جیل
پایۂ تکمیل کو پہنچا چکا ہوں۔ اِس سے قبل ۱۹۷۶ء میں ساہیوال (پنجاب) کے ڈراؤنے جیل
میں بلوچستان پر ایک کتاب "بلوچستان کی کہانی شاعروں کی زبانی" لکھ چکا ہوں جسے
اکیڈمی کوئٹہ نے چھاپ دیا ہے اور سُنا ہے کہ بازار میں آگئی ہے۔ متذکرہ بالا دونوں
کب چھپیں گی، سرِ دست میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

کسی بھی دُوسری زبان میں اشعار کا منظوم ترجمہ کرنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ ترجمے سے تو صرف شاعر کے خیالات کا ایک دھندلا سا عکس بڑی کاوشوں کے بعد، کوئی عالم و فاضل شخص جو دونوں زبانوں پر کامل عبور رکھتا ہو پیش کرنے پر قادر ہو سکتا ہے چہ جائیکہ شاعر کے پروازِ تخیل، شوکتِ لفظی، صوتی اثرات اور روانیٔ گفتار کی مسرت خیز کیفیتوں کو ترجمے میں منتقل کیا جا سکے۔ البتہ نثری ترجمہ میں کسی حد تک بات بنائی جا سکتی ہے مگر وہ بھی بقول کسے "قالین کی اُلٹی طرف" کے مصداق ہوتا ہے۔

میں نے بلوچی شعراء کے کلام کا ترجمہ اُردو نثر میں کرنے کی کوشش کی ہے اور اس طرح سے کی ہے کہ ترجمہ میں بلوچی کی بندش قائم رہے یعنی اظہارِ خیال کی صورت وہی ہو جو شاعر نے اختیار کی ہے۔ ممکن ہے اُردو دان حضرات کے نزدیک یہ صورت غلط ہو لیکن میں سمجھتا ہوں کہ بلوچی شاعر کو ٹھیک طور پر سمجھنے کے لئے دُوسری صورت بناوٹی معلوم ہوگی۔ جیسا کہ بعض بلوچی شعراء کے اشعار کے اُردو ترجموں میں دیکھا جاتا ہے۔ شاعر کچھ کہتا ہے اور مترجم اُردو اصطلاحات کی پیروی کرتے ہوئے کچھ اور لکھ دیتا ہے۔ بعض حالات میں ترجمہ شاعر کے کلام سے زیادہ فصیح و بلیغ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ مسٹر لانگ ورتھ ڈیمز Longworth Dames بھی جو بعض قدیم بلوچی شعراء کے کلام کا انگریزی ترجمہ پیش کر چکے ہیں۔ اس طبع سازی سے پاک نہیں رہ سکے ہیں۔

میں نے ان تراجم میں حتی الوسع یہ کوشش کی ہے کہ جیسا اور جس طرح شاعر نے مضمون باندھا ہے اُسے من و عن اُسی رنگ میں پیش کیا جائے۔ جہاں جہاں ضروری وضاحت کے لئے الفاظ بڑھانے پڑے ہیں اُن کو قوسین (   ) میں دیا گیا ہے تاکہ امتیاز قائم رہ سکے۔ اس طرح میرے خیال میں بلوچی شاعر کے سادہ اور دلنشین کلام کو زیادہ بہتر طور پر سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

بلوچی اشعار کے ترجمے میں جو دُوسری مشکل پیش آتی ہے وہ بلوچی الفاظ کے مترادف اور ہم معنی اُردو الفاظ کی تلاش ہے۔ بلوچی شاعر بالخصوص جن ادوار کے شعراء کے کلام کا ہم نے انتخاب کیا ہے ایک بھولا بھالا خانہ بدوش شخص تھا۔ وہ ماسوائے دورِ متاخرین کے چند ملاؤں کے لکھا پڑھا نہیں تھا البتہ شاعری اُس کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ وہ فطرت سے اثر پذیر ہوتا اور موج میں آ کر گا اٹھتا

کی ترجمانی کیا کرتا تھا۔ پہاڑوں، وادیوں اور دشت وصحرا میں وہ اپنے مال ومویشی کے پیچھے گھومتا پھرتا اور
وہاں پر بود وباش رکھنے والے چرند وپرند کے علاوہ بادل، بارش اور کُہر، بجلی کی چمک، تند وتیز آندھیوں
اور جھکڑوں کے طوفان اور بپھری ہوئی پہاڑی ندیوں کی طغیانی، موسم بہار کے پُرکیف شب وروز، سبز
گھاس اور جنگلی پھولوں کی مہک اور پھر گرمیوں کے دن جب لُو شعلے برساتی ہوئی چلتی ہے اور سردیوں کا
موسم جب شمال کی سرد ہوا گوریچ جو ہڈیوں کے گودے تک کو جما دیتی ہے اور قدرت کے وہ تمام
مناظر جو شب وروز اُس کی آنکھوں کے سامنے رہتے۔ ان ہی میں سے وہ اپنی تشبیہوں اور استعاروں
کا انتخاب کرتا اور کمال چابک دستی سے ان کو اپنے اشعار میں الفاظ کا جامہ پہنا کر نہایت خوبصورتی اور
دل آرائی سے پیش کیا کرتا تھا۔

ان شعراء کے بعد دورِ متاخرین کے وہ شاعر آتے ہیں جن کو بستیوں میں آباد، کھاتے پیتے
لوگوں، اُمراء، زمیندار، تاجر اور اسی قماش کے دوسرے دولتمندوں اور جاہ طلبوں کی زندگی قابلِ رشک
معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے وہ اپنی محبوبہ کو بھی ریشمی ملبوسات میں، سونے چاندی کے زیورات اور ہیرے
جواہرات سے لدا پھندا دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اُردو زبان میں ایسے الفاظ نہیں
ملتے جو ان پہاڑوں، وادیوں اور زیورات وملبوسات وغیرہ کے لئے بولے جاتے ہیں۔ اُردو یا ہندی
میں ایسے الفاظ یقیناً بکثرت ہوں گے لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم اپنی بے بضاعتی کی وجہ سے اُن سے کماحقہٗ
شناسا نہیں اور جن الفاظ سے ہم شناسا ہیں اُن کی تعداد محدود ہے اور وہ پوری طرح ہماری مشکل کشائی نہیں
کر سکتے۔ مثلاً یہ کہ اُردو میں کوہستان کے ضمن میں صرف پہاڑ، چٹان، گھاٹی، کھائی اور پتھر کے نام جانتے ہیں
جبکہ بلوچی میں جب ہم اُن ناموں کو دیکھتے ہیں جو ہمارے بادیہ نشین اور کوہ گرد شاعر اپنے اشعار میں لاتے
ہیں تو ہماری لغت ختم ہو جاتی ہے۔ بلوچی میں صرف پہاڑوں سے متعلق بیسیوں نام ملتے ہیں، پہاڑوں
کی قسمیں، چٹانوں کی ساخت، چٹانوں کی قسمیں، گھاٹیاں اور ان کی قسمیں، کھائیاں اور ان کی قسمیں، پتھروں
کے مختلف نام غرضیکہ پہاڑ سے متعلق کوئی ایسی چیز نہیں جو مختلف ساخت کی ہو اور اُس کا کوئی مخصوص
نام نہ ہو۔ مات کوہ، مات بند، کوہ، جُمب، جُب، شور یا شیر، تلانگ، تلار، چگرک، اشی،

Scanned with CamScanner

درنگ، رگر، گرتھ، بھن، سرپہ، لکت، ڑنگ اور بدرنگ وغیرہ بیسیوں ایسے نام ہیں جو صرف پہاڑ سے متعلق ہیں، پہاڑی ندیوں، نالوں، وادیوں اور دشت و بیابانوں سے متعلق جو نام ہیں وہ ان کے علاوہ ہیں۔

جہاں تک لباس اور زیورات کا تعلق ہے اُن میں اکثر ایسے ہیں جو دونوں جگہ مستعمل ہیں اس لئے اُن کے مترادف نام مل سکتے ہیں یہی حال لباس و پوشاک کا ہے البتہ بعض صورتوں میں فرق پڑ جاتا ہے مثلاً ہم بلوچ خواتین کی پشک یا جامگ کو جو کم از کم پانچ گز کا ایک فراغ نما لباس ہوتا ہے قمیص نہیں کہہ سکتے لیکن بلوچی گند یا سرینگ کو جو ڈھائی گز کے دو پٹوں کو یکجا سی کر بنتا ہے دوپٹہ کہیں گے جو اُس کے لئے زیادہ مناسب ہے۔ یہی حال بعض زیورات کا بھی ہے۔

اس ضمن میں جو کچھ میں ذکر کر رہا ہوں اُس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ میں اپنی کمزوریوں کو چھپانے کے لئے بہانہ سازی کر رہا ہوں بلکہ ایک حقیقت بیان کر رہا ہوں اور اُس کا حل جیسا کہ قارئین متن میں دیکھ لیں گے میں نے یہ تجویز کیا ہے کہ جس نام کی مترادف اُردو ہمیں نہیں آتی یا اُردو نام لکھنے سے اُس کا صحیح اظہار نہیں ہوتا اُسے بلوچی ہی رہنے دیا جائے اور حاشیے میں اُس کی تشریح کی جائے یہ طریقہ ممکن ہے اُردو دان حضرات کے ذوقِ سلیم پر گراں گذرے لیکن ہمارے لئے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں۔

اس کے علاوہ بلوچی کے بعض ایسے مفرد الفاظ بھی آتے ہیں جن کا اُردو ترجمہ ایک پورے فقرے سے کم میں نہیں ہوتا، جیسا کہ بلوچی کا لفظ اُمل ہے۔ جو اسم صفت ہے اسے ہم اُردو کے لفظ انمول کے مترادف کہہ سکتے ہیں لیکن بلوچی میں اس کے معنی ہوں گے "میری انمول محبوبہ"۔ یا جیسا کہ تہکنج جو اسم صفت ہے اور محبوبہ کے لئے بولا جاتا ہے اور اس کے معنی ہوں گے "اندھیری رات کا چاند" میرے خیال میں ترجمہ کرتے وقت یہ الفاظ بلوچی میں ہی اچھے لگتے ہیں اس لئے ان کو ایسے ہی رہنے دیا گیا ہے البتہ حاشیے میں اُن کی تشریح کر دی گئی ہے۔

[illegible] اور فارسی شعراء

Scanned with CamScanner

ہاں نہیں ملتے بلکہ کچھ عجیب لگتے ہیں لیکن ہمارے بلوچی کے بڑے بڑے شاعروں نے انہیں استعمال کیا ہے۔ مثال کے طور پر بلوچی کے ملک الشعراء جام درک نے اپنی محبوبہ کے سینے کو "دُمب مار" یعنی "سانپ کی دُم" سے تشبیہہ دی ہے اور اُس کی ناک کو "کٹار" کہا ہے۔ تو کلی مست نے سمو کو پیپل کے درخت سے تشبیہہ دی ہے اور ماہناز نے اپنے کوہتن "ناگیں انجیر" یعنی "انجیر کا چوڑے پتوں والا درخت" کہا ہے۔ ہم نے ایسی تشبیہات کا ترجمہ بھی ایسا ہی کیا ہے۔

علاوہ ازیں، بلوچی کی، جدید شاعری سے قبل صرف ایک ہی صنف ہوتی تھی جسے شئیر کہتے ہیں۔ شئیر کا مترادف شعر تو ہو سکتا ہے لیکن بلوچی میں رزمیہ، بزمیہ، غنائیہ، قصیدہ اور غزل سب کے لئے شئیر ہی بولا جاتا ہے۔ میں نے اس کے انداز بیان اور بندش کے پیش نظر اس کا ترجمہ "نظم" کیا ہے۔ نظم اگرچہ تمام اصناف سخن پر محیط نہیں لیکن، بلوچی کے شئیر سے کسی حد تک مشابہت رکھتی ہے اس لئے موزوں ہے اسی طرح بلوچی کا ایک دوسرا لفظ "گُدان" ہے جو ایک خاص قسم کا چھپر نما مکان ہوتا ہے، جس کی لمبائی کی دیواریں تین چار فٹ سے زیادہ اونچی نہیں ہوتیں البتہ چوڑائی کی دیواریں مخروطی ہوتی ہیں جن پر شہتیر ڈال دیا جاتا ہے اور چھت گھاس پھونس کی ہوتی ہے لیکن شاعروں نے اسے خیمے کے معنوں میں استعمال کیا ہے اس لئے میں نے گُدان کا ترجمہ خیمہ کیا ہے جو زیادہ مناسب لگتا ہے۔

جہاں تک بلوچی شاعری کا تعلق ہے اس سے متعلق ہم اس کتاب کی پہلی جلد "بلوچی کی رزمیہ شاعری" میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں اس لئے یہاں پر اس بحث کو پھر دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلوچی کے ان نامی گرامی شعراء کے کلام سے جن کی نظموں کا موضوع کے مطابق ہم نے انتخاب کیا ہے۔ یہ حقیقت بخوبی واضح ہوگی کہ بلوچی شاعری کا میدان بہت وسیع ہے اس میں ہر قسم کے مضامین باندھنے کی استعداد موجود ہے جیسا کہ علامہ اقبال نے فرمایا ہے؛

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی!

آخیر میں اس امر کی وضاحت کو بھی میں ضروری سمجھتا ہوں کہ بلوچی کے شعراء اور ان کے کلام کے موضوع وار انتخاب میں، میں نے بلوچستان کے کسی ایک حصے کے شعراء یا کسی خاص شاعر کے کلام سے

Scanned with CamScanner

استفادہ نہیں کیا ہے بلکہ تمام بلوچستان اور اُس کے ہر دور کے مشہور و معروف شعرا کے کلام کو (ماسوائے دورِ جدید کے) بطورِ نمونہ یا مثال پیش کیا ہے تاکہ کسی علاقہ کے کسی ادب دوست رفیق کو یہ گلہ نہ رہے کہ علم و ادب کی اس مجلس میں شرکت سے اس کے علاقہ کو محروم رکھا گیا ہے۔

والسلام

بمشکِ چین و چگل نیست بوئی گُل محتاج
کہ نافہاش ز بندِ قبای خوشتین است

(حافظ)

گل خان نصیر

سنٹرل جیل حیدرآباد سندھ

۵ مئی ۱۹۷۷ء

۱

محبوبہ کے سراپا کے بیان میں

بلوچی عشقیہ شاعری میں محبوبہ کے سراپا کا بیان بہت زیادہ ملتا ہے۔ تقریباً ہر دور میں ہر شاعر نے اس موضوع پر کچھ نہ کچھ ضرور کہا ہے۔ شعرائی متقدمین جن میں بی بگر رند اور شے مُرید سر فہرست ہیں۔ زیادہ سلیس اور عوامی زبان استعمال کرتے ہیں جبکہ متاخرین نے جن میں ملا فاضل رند، میر مولاداد رتیبانی اور فضل فقیر قابلِ ذکر ہیں زیادہ گنجلک اور فارسی آمیز زبان سے کام لیا ہے البتہ توکلی مست اور اس دور کے دو چار اور شاعروں نے زبان کی سلاست اور عوامیت کو بحال رکھنے کی کوشش کی ہے جیسا کہ متعلقہ شعرا کے اشعار سے ظاہر ہوتا جائے گا۔

بلوچی کا مایۂ ناز شاعر بی بگر رند اپنی محبوبہ کی شان میں کہتا ہے:۔

شَر سَرو بے عیب و کمان میانے
چمے مان نیست من پرنز و دَنتانان
گُدّ حیں چمی چو بامی استارءَ
گردن چو کُنڈی لسّہ ئیں مارءَ
جیئی تا پدّ و دل کپی گُلگارنت
شیگیں پونزانی پلو سوارنت

یعنی

(میری محبوبہ کا) سر خوشنما اور بے عیب ہے۔

اُس کی کمر کمان جیسی ہے۔

اُس کی ناک اور دانتوں میں بھی کوئی عیب نہیں۔

اُس کی کٹورے جیسی آنکھیں صبح کے ستارے کی مانند ہیں۔

اُس کی گردن

کُنڈلی مارنے والے سُتھرے سانپ جیسی ہے۔

اُس کا گریبان

گلے سے جیب تک، کَشیدہ کاری سے گُلریز ہے۔

اور اُس کی سلائی جیسی بستراں ناک پر

نتھ چڑھی ہوئی ہے۔

بلوچی کا زندہ و جاوید شاعر اور عاشقوں کے دربار کا صدر نشین "شے مُرید" مکّہ معظمہ سے کبوتر کو پیغام دیکر اپنی محبوبہ ہانی کے پاس بھیجتا ہے۔ مکّہ سے دربار کا کبوتر کیا جانے کہ اتنی بلوچ حسیناؤں میں "شے مُرید" کی ہانی کونسی ہے۔ شے مُرید کو اس کا احساس ہے اس لئے وہ کبوتر کو ہانی کو شناخت کرنے کی نشانیاں ایک ایک کرکے بتاتا ہے۔

ہانی، اِن دنوں رند بلوچ قبیلے کے مشہور سردار میر چاکر کے حرم میں ہے۔ میر چاکر نے اُسے امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ سے رکھا ہے جس کا اظہار شے مُرید اس طرح کرتا ہے۔

نشتہ جنے مونجھا ڑ وین

سر بند و سیا ہماری پُشتین

سر زندی سر گنڈ ءُ برِنت

جُتی اِشراچ ڈگھا پورِ نت

شاریں سرنی آگُشت

نو لکھ ءُ ہارے من گُو ترِنت

بیشداری گُملّ ءِ تنگہ اِنت
نشتیں جہی اَبریشمنت
ہانی، ہما انت پھلگدیں۔

یعنی

(اے کبوتر! جب تم وہاں پہنچو گے تو تمہیں)
ایک عورت غمگین بیٹھی ہوئی نظر آئے گی
اُس کا سر بند[1] کالے رنگ کا ہوگا
اُس کے گیسو کالے ناگ جیسے (بل کھاتے ہوئے) ہوں گے۔
اُس کی کنگھی صندل کی لکڑی سے بنائی گئی ہے
اُس کی جوتیاں، ڈھاپور[2] کی بنی ہوئی ہیں
اُس کا ریشمی دوپٹہ آگم[3] کا ہے
نو لاکھ روپے کا ہار اُس کے گلے میں ہے
اُس کے خیمے کا اگلا چوب چاندی کا ہے
اور وہ خود ریشمی گدیلے پر بیٹھی ہوئی ہے
یہی خوش پوش حسینہ ہانی ہے

بلوچی کے پُرگفتار شاعر جام دُرک کی محبوبہ کے رنگ ڈھنگ انوکھے ہیں۔ وہ انسان سے بالاتر ایک ایسی ہستی ہے جسے جام دُرک مظاہر فطرت کی تشبیہ سمجھتا ہے۔ جام دُرک ایک قادر الکلام اور حُسن فطرت کا شیدائی شاعر ہے۔ فضا میں دھنک کی رنگینیاں دیکھ کر اُسے اپنی محبوبہ کی صورت نظر

---

[1] سر پر باندھنے کی پٹی
[2] ایک شہر کا نام
[3] ایک خاص قسم کا ریشمی کپڑا

آتی ہے۔ کہتا ہے :۔

مرستا یک درجیئے شہ ذکنی و بارہ
پہ گوَرَ واستینے عجب رنگین
دُراہنی دوست وہ فہدبش گون منت

یعنی

جنوب کی طرف سے جو ایک دھنک اُبھری ہے
اور جس کے پاس ہی
بادل کا ایک عجیب رنگ برنگی ٹکڑا تیر رہا ہے
اُس میں
میری محبوبہ کی تمام صفات موجود ہیں

جام دُرک نے ان تین ابیات میں ایک وسیع مضمون باندھا ہے۔ یوں کہو کہ دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ دھنک تب ہی اُبھرتی ہے۔ جب بارش برس چکی ہو اور ہوا میں رطوبت موجود ہو۔ بلوچستان جیسے ایک خشک ملک میں جہاں بارش شاذ و نادر برستی ہے۔ بارش کا برسنا ایک بلوچ کے دل و دماغ میں ایسی سرمدی کیفیت پیدا کر دیتا ہے جیسی کہ ایک بچھڑی ہوئی محبوبہ سے کئی سالوں بعد ملاقات کے وقت پیدا ہوتی ہے۔ اُس وقت دل و دماغ میں جو پُرکیف رنگینیاں پھوٹتی ہیں اُن سے دھنک کے پاس کے ٹکڑۂ ابر کی طرح تمام ماحول متاثر ہوتا ہے۔ یہاں شاعر کی خوشی سب کی خوشی بن جاتی ہے۔ وہ ہستی جس سے نور کی طرح خوشیاں پھوٹتی ہیں وہ جام درک کی محبوبہ ہے۔

یہاں یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ جام درک کی محبوبہ جیسا کہ روایت چلی آتی ہے ایک عالی نسب خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اس لئے اگر جام درک اپنے اشعار میں اُس کی شاہانہ سج دھج کا ذکر کرتا ہے تو اُس ہی حق بجانب ٹھہرتا ہے لیکن جب دُوسرے شعراء اُس کی پیروی میں اور دیکھا دیکھی اپنی بادیہ نشین اور جفاکش محبوباؤں کو بھی تختِ طاؤس پر جا بٹھاتے ہیں تو یہ ایک علت بن جاتی ہے جس سے بلوچی شاعری وہ حقیقت

بیانی اور عوامیت جو شعرائے متقدمین و متوسطین کا طرۂ امتیاز رہی ہے متاثر ہو جاتی ہے۔ اُس کی جگہ تصنع
اور غلو پیدا ہوتا ہے جو شاعری کو بے جان اور اُمراء و رؤسا کی مجلس آرائیوں میں محض تفریحِ طبع کا سامان بنا دیتا
دورِ متاخرین کے اکثر بلوچ شعراء اس مرض میں مبتلا نظر آتے ہیں اس لئے اُن کی منظومات ایک ایسی
بے جان مورت کا عکس معلوم ہوتی ہیں۔ کسی جیتی جاگتی، ہنستی بولتی اور خرامِ ناز دکھلاتی ایسی محبوبہ کی شبیہ
ہوتیں جو شاعر کے ساتھ، اُسی معاشرہ، ماحول اور طبقے میں رہتی ہو جس میں خود شاعر گذر بسر کر رہا ہوتا
جام دُرک اپنی محبوبہ کو جس رنگ میں دیکھتا ہے، اُس کی ایک ایسی تصویر کھینچ دیتا ہے جو قاری کو حقیقی
معلوم ہوتی ہے اور تصور کی نگاہیں اُسے آج بھی مجسم دیکھ لیتی ہیں مثلاً دُرک کہتا ہے:-

دیستوں مردمے لُڈ ؤ کین
زیبا، جیر پر ؤ مہتو سین
مُرگھانی وزیر تا ہو سین
لعل من ہمراں ؤت شاہین
دا اُبستی ہو گُراہین
سہت ؤ زیوراں زیبا آئین
ؤت گوریں قبولی ماہین
نمیں کہ یہ جدائی راہین

یعنی

مَیں نے ایک شخص کو خراماں دیکھا
جو خوبصورت، خوش شمائل اور حسین
اس قدر ہے کہ
چاند اُس کے حسن کے سامنے ماند پڑ جاتا ہے
وہ پرندوں کے وزیر، طاؤس کی طرح ہے۔

اپنے ہمسروں میں وہ بادشاہ ہے
اُس کی ادائیں تڑپا دیتی ہیں
وہ زیور، گہنوں میں بہت حسین لگتی ہے
وہ حُسن کی مُنہ بولتی تصویر ہے
اور چاند کی طرح قبول صورت (حسین) ہے
(مگر افسوس کہ) وہ اب
ہم سے جُدائی کی راہ پر چل پڑی ہے۔

جام دُرَک خود تو اپنی محبوبہ کے پاس نہیں جا سکتا تاہم ایک رازدار کے ذریعے اُسے اپنے [پاس] بُلاتا ہے۔ اُس شریک راز کے ساتھ جس طرح جام دُرَک اپنی محبوبہ کے سراپا کو سراہتا ہے وہ [قابلِ] غور ہے۔ کہتا ہے:-

من شِشتان مُحرمے پہ باطنی ءَ
بگنت معلوم منی جنجیں پری ءَ
دو مُند رنگے وتی مان انت گلی ءَ
گورزہ ءِ تعویذ گوں زرءِ ہَتّلی ءَ
یکو چاپنٹ من سُوزیں جگری ءَ
بناتی پُنٹ و پوشان ہِکَھلی ءَ
شلان ءِ بیت دان ڈیل ءِ منی ءَ
رُدان ءِ بیت چو ماہ ءِ چاردھی ءَ

یعنی

میں نے درپردہ اپنے ایک رازداں کو بھیجا
کہ وہ جا کر میری اتنی حسین اور پری جیسی محبوبہ کو،

جس کی انگلیوں میں دو دو انگوٹھیاں ہیں
جس کے گلے میں طلائی طوق پڑا ہُوا ہے
جس کے سینے پر ایسے تعویذ لٹک رہے ہیں
جن پر چاندی کا خول چڑھا ہوا ہے
جس کے نتھنوں پر سبز نیلم کی نتھ ناچ رہی ہے
اور جس کا لباس بانات ، ریشم اور مخمل کا ہے ۔
اطلاع دے کہ وہ
چودھویں کے چاند کی طرح اُبھرتی اور نُور برساتی ہوئی
میرے پاس چلی آئے ۔

جام درک زبان کا مالک ہے ۔ وہ طرح طرح سے اپنی محبوبہ کے سراپا کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان رہتا ہے ۔ اپنی ایک مشہور نظم میں قاصد سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے :-

اے گشنت منی دوست بشان
سرمچے گوں سوئیں ڈاوناں
زُلف بارگنت چو کاگھان
دنتانی چو موتی پچان
چوکہ زری مرواردان
من کام دگیس درمیان ۔
مژگان مسالے ناوکان
بُروانی جانِ دشمنان
انگی چو تاریں میان
سر جیگی بازیں سُنبلان

زلفی شا پار کیں مار آتان
بشکھند کنت زیری گمان
بی دوست! تئی مرضی، گلّان!

یعنی

میری محبوبہ کی نشانیاں یہ ہیں:
وہ قد میں سرو کی مانند ہے
اُس کے گلے میں طلائی ہار ہے
اُس کے ہونٹ کاغذ کی طرح پتلے ہیں۔
اُس کے موتیوں جیسے دانت
سمندری مروارید کی طرح
اُس کے ہونٹوں کے درمیان چمکتے ہیں۔
اُس کی پلکیں تیر
اور ابرو کمان کی طرح ہیں۔
اُس کی کمر پتلی اور ناک کٹار کی طرح ہے۔
اُس کے گریبان پہ
سُنبل کے بیل بوٹے کاڑھے ہوتے ہیں۔
اُس کی زلفیں پتلے سانپ کی طرح ہیں
اور، جب وہ مسکراتی ہے
تو غم (کے بادل) چھٹ جاتے ہیں۔
اے میری پیاری محبوبہ!
جو تیری مرضی ہو، میں خوش ہوں۔

بلوچ شعرا عموماً گھنگھور گھٹاؤں اور کڑکتی بجلیوں کے متوالے ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ یہی ان کے گذارہ معاش کے اسباب پیدا کرتی ہیں اور ان کو زندہ رکھتی ہیں ورنہ ان بے آب و گیاہ صحراؤں اور کوہستانوں میں نمو کی اور کوئی صورت ہی نہیں۔ گرجتے برستے بادلوں کو دیکھ کر اکثر بلوچ شعرا کی طبیعت رواں ہو جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں کے افتتاحیہ چند بیت اکثر بارش و باراں سے متعلق ہوتے ہیں۔

جام درک اپنی محبوبہ کا سراپا بیان کرتے ہوئے باد و باراں کا جس دلکش پیرائے میں ذکر کرتا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ کہتا ہے :-

دوشی گروکان پُرحشر
نو دو جڑاں بستہ متر
گوَرَ تہ خوراسان ءِ نگرَ
شالکوٹ ءِ مستنگ ءِ گدر[۲]
مینتش اُمَل ءِ سیمبر
آ نازمینین لب شکر
دوست پہ امیری نازد پر
پہ شان، شوقتی گمر
اسکالی امل گوہر
آ ماہ جبین شمس و قمر
چندی کسان بستہ نتر

یعنی
پچھلی رات کو
کڑکتی ہوئی بجلیوں نے ایک حشر برپا کر دیا

---

[۱] موجودہ کوئٹہ [۲] موجودہ مستونگ

جھکے اور گھنے بادلوں نے جھڑی لگا دی۔

خوراسان کی ڈھلوانوں

اور شالکوٹ و مستنگ کی گذرگاہ پر

خوب برسے۔

میری شکر لب، نازنین، اُمّل کے بدن کو تر کر دیا۔

میری محبوبہ

اُمیرانہ شان اور اداؤں والی ہے

اُس کی ادائیں ایک خاص شان اور دلکشی رکھتی ہیں۔

وہ ایک گوہر آبدار کی طرح دمکتی ہے

وہ چندے آفتاب اور چندے مہتاب ہے۔

اُس کے عاشقوں کی قطار لگی ہے۔

جام دُرک ایک دفعہ اپنی محبوبہ کو بارش میں بھیگتے ہوتے دیکھتا ہے۔ اس وقت اُس کی محبوبہ کی جو حالت ہوتی ہے اور دُرک پر جو کیفیت گذرتی ہے اُس کا نقشہ اِس طرح کھینچتا ہے:۔

مہنا و شاری کپ ننگاں

ملگھور و زلفی مینتگاں۔

جان ء گلابی پیرہن

زربفت و کاشی تحلبدان

مینت سمین ء جان و تن

شہمی ء کلیت شعلوان

من لیل و تاریکیں شپان۔

---

۱ ناک پاس ۲ احوال (محبوبہ)

یعنی

اُس کے سر سے رنگین ریشمی دوپٹہ کھسک گیا ہے
اُس کے گھنے کاکل اور زُلفیں بھیگ گئی ہیں۔
اُس کے جسم پر گلابی پیرہن کو
جو زربفت اور کاشی کے گلبدن کپڑے کا ہے
اور اُس کی جان و تن کو بھی
بارش کی جھڑیوں نے تر بتر کر دیا ہے۔

اُس کے سفید بدن سے
نُور کی شعائیں ایسی پھُوٹتی ہیں
جیسے تاریک رات میں
آگ سے شعلے نکلتے ہوں۔

اسی مضمون کو جام دُرک سے تقریباً دو سَو سال بعد توکلی مست نے باندھا ہے۔ جس کا ذکر مناسب مقام پر بعد میں آئے گا۔

محبُوبہ کے سراپا کی تعریف میں گو کہ ہر شاعر تعلّی کرتا رہا ہے لیکن ملک دینارِ عبداللہ خان میر وانی نے بہت زیادہ غلو سے کام لیا ہے۔ ملک دینار دورِ متاخرین کا شاعر ہے جو فارسی سے زیادہ متاثر ہے۔ اُس دور کی بلوچی شاعری میں لفاظی کو کمالِ فن کا درجہ حاصل رہا ہے۔ اکثر بلوچی شعراء نے اپنے کلام کو فارسی الفاظ سے چمکانے اور مزین کرنے کی کوشش کی ہے اور اسے اپنی قابلیت و علمیت کے اظہار کے لئے لابدی سمجھتے اور اُس پر فخر کرتے رہے ہیں۔ ان ہی شعراء میں ملک دینار کا شمار ہوتا ہے۔ اُس نے فارسی میں بھی اشعار کہے ہیں لیکن اُن کی فارسی میں بھی اسی طرح بلوچی کی آمیزش ملتی ہے جس طرح اُن کی بلوچی فارسی آمیز ہے۔ البتہ بسا اوقات اُس نے ٹھیٹھ بلوچی میں بھی شعر کہے ہیں جو [illegible] دلنشین ہونے کے علاوہ فصیح بھی ہیں۔ بہر حال، ملک دینار اپنی محبوبہ

کے سراپا کی تعریف میں کہتا ہے :۔

نہ دیستوں حُسنیں دوست در چہار

اچ آں کیچ مکران ، تاں آ قندھار

گرنتے مہتابے چہ عرش ء کنار

جمی خوش قد و خوش رنگ و خوش زیبدار

کہ مہلنج و مہر نگ و ماہ ء گہار

عجب جوڑ کُت قادریں کردگار

یعنی

چاروں اطراف عالم میں

کیچ مکران سے قندھار تک

میں نے اس جیسی کوئی اور حسینہ نہیں دیکھی ۔

یوں کہو کہ

وہ عرش کے اُفق سے طلوع ہوتا ہوا ایک چاند ہے

اس کا کیا ہی اچھا قد ہے

کیا اچھی صورت اور کیا زیبائی ہے

وہ ماہ شب تار ، ماہ لقا اور مہوش ہے

قادر کردگار نے

اُسے اپنی خاص قدرت سے بنایا ہے ۔

شاعری میں بھی عورت کی زبان زیادہ سلیس اور شیریں ہوتی ہے ۔ زہیروک بلوچی شاعری کی ایک مخصوص صنف ہے اس میں ہجر و فراق اور دیدار یار کی تڑپ اور خواہش وصل کے مضامین باندھے جاتے ہیں ۔ یہ عموماً عورتوں کی شاعری ہوتی ہے جو فراق یار میں اس کے بول خود موزون

کرتی اور گاتی ہیں۔ ایک زہیروک کے چند شعر ملاحظہ ہوں جن میں محبوبہ اپنے محبوب کے سراپا کی تعریف میں کہتی ہے :-

بالادی تَشتی تراشتگیں میانے
لنکّی، تُگل بوگنت قلم نگشین
چمّی، گرتگے بادام مَنت خوراسانی
پونزی، گرتگے کنارے بلوچانی
بوری، بہ بادامءِ بنءَ بستہ
جندی مس ہیرءِ سایگءَ نشتہ
ہیری پہ ہیر واریں دپّ وارتہ
مسک، مزاریں سرکو پگاں مُشتہ۔

یعنی

اُس کی قامت اور اُس کی کمر کو
قدرت نے جیسے تیشے سے تراش کر بنایا ہے

اُس کی انگلیاں
زسل کے قلم کی طرح منقش ہیں۔
اُس کی آنکھیں
یوں کہو کہ خوراسان کے بادام ہیں۔
اُس کی ناک
بلوچی کنار جیسی ہے۔

اُس کا جھومرا
بادام کے درخت کے نیچے بندھا ہوا ہے

Scanned with CamScanner

اور وہ خُود

اِلائچی کے درخت کے سائے میں بیٹھا ہے۔

اُس نے الائچی کھائی ہے،

اس لئے اُس کے مُنہ سے اِلائچی کی خُوشبو آ رہی ہے۔

اُس کے جسم سے مہک اُٹھتی ہے،

اس لئے کہ اُس نے اپنے شیر جیسے شانوں پر مُشک ملا ہے۔

شاہ پسند خان سنجرانی، استعاروں میں اپنی بات کہنے کا شائق ہے۔ اس کی زبان دقیق مگر معنی آفرین ہے۔ وہ خود چونکہ چاغی کے قبیلہ سنجرانی کے امیر گھرانے سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اُس کی محبوبہ بھی امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ کی ایک خاتُون ہے۔ شاہ پسند خان اپنی محبوبہ کو "بیوفا" اور "بے ثمر درخت" کہنے کے باوجود، اُس کے سراپا کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتا ہے۔ کہتا ہے:

یک عجب درختے کہ دیستوں در چمن بے حاصلین

کج و تابدار و کمان، تحت القمر، ہلاں تلین

در نگ اَنت لال و ثمر، عود و عبیراں سُنبلین

زیر آبرُوان دلبر کدھوان اسیاہ کُلکین

زیب دنت بینی اَلف، گوں اشرفیاں گلگلین

طوطی آلودہ لبنت، مینا خوش آواز بلبلین

دُرّ و گوہر ھمہ دو رشی، گردوک، آسی جبلین

حلقواں پیوست اَنت، مرجان و یاقوت سے شلین

گر میچ و دو کانیں گوتر و ملگی صیان، قبا گلین

گٹ و دست و نک و جواہر گوں طلایاں تلملین

خاتمی بسور بیں نگین، الماس و باسیمار نلین

مرگھ تا ہوس رنگ برنگ نقش و نگار زر باز رنگین -

یعنی

مَیں نے باغ میں ایک عجیب بے ثمر درخت دیکھا -

جو کج ادا، تابدار گیسوؤں والی

اور چاند کے ہالے کی طرح

رنگ برنگے ملبوسات میں جلوہ افروز تھی -

اُس لالہ رنگ محبوبہ سے

عُود، عبیر اور سُنبل کی مہک اُٹھتی تھی -

اُس دلبر کے ابروؤں کے نیچے

کاجل سے سیاہ کی ہوئی اُس کی آنکھیں

کٹوروں جیسی تھیں -

اُس کی ستواں ناک میں

فیروزی نگینے والا سونے کا بُولا زیب دے رہا تھا -

اُس کے ہونٹ، طوطے کی منقار کی طرح سُرخ

اور اُس کی آواز، بُلبل و مَینا کی آواز جیسی تھی

اُس کے گلوبند میں

موتی اور جواہرات ایک ہی لڑی میں پروئے ہُوئے

بجلی کی طرح چمکدار اور آگ کی طرح شعلہ فشاں تھے -

اُس کے کانوں میں، مرجان و یاقوت کے جُھمکے

اور گردن میں تین لڑیوں کا ہار پڑا ہُوا تھا -

اُس کا سینہ، رونق افروز

Scanned with CamScanner

اُس کی کمر، زرسل کے قلم کی مانند پتلی
اور اُس کی قد و قامت
ایک خوشنما مینار کی طرح بلند و بالا تھی۔
اُس کے گبٹ[1]، تملّ[2] اور دستونک[3]
سونے اور جواہرات کے تھے۔
اُس کی انگوٹھیوں کے نگین الماس تھے۔ الماس کے نگینوں والی انگوٹھیاں
اُس کی زرسل جیسی انگلیوں میں
بہت اچھی لگ رہی تھیں
وہ رنگ برنگے نقش و نگار والی
ایک ایسی مورنی تھی
جس کے پَر زرّین تھے۔

میر مولاداد رَمیسانی اگرچہ فارسی گو شاعر تھا لیکن کبھی کبھی بلوچی میں بھی شوق کیا کرتا تھا۔ اُردو میں بھی اُس کی دو چار غزلیں ملتی ہیں۔ دیوانِ مولاداد کے نام سے اُن کا فارسی کلام چھپ چکا ہے۔ محمد حسن صاحب حسن، بدوزئی بنگلزئی اور مرزا احمد علی صاحب احمدؔ داروغہ خیل، جو دربارِ قلات کے مشہور فارسی گو شاعر گذرے ہیں میر مولاداد کے ہمعصر تھے۔ فارسی میں شعر کہتے تھے لیکن کبھی کبھی تفریحِ طبع کے لئے بلوچی سے بھی کام لیا کرتے تھے۔

میر مولاداد رَمیسانی ایک ہفت زبان بسیار گو شاعر تھا۔ اُس کی بلوچی جسے عرفِ عام میں ہم کلاتی بلوچی کہتے ہیں درباری زبان ہونے کی وجہ سے زیادہ فارسی آمیز ہے۔ البتہ اندازِ بیان اُس دور کے عام بلوچی زبان کے شاعروں کا سا ہے جو اپنی محبوبہ کے انتخاب میں بہت زیادہ جاہ پرست واقع

---

[1] [2] [3] ہاتھوں میں پہننے کے بلوچی زیور۔ الخ

ہوتے ہیں۔ درحقیقت، بلوچی کے شاعروں میں یہ رجحان انگریزوں کی غلامی میں رہنے سے پیدا ہوا ہے جبکہ عملی قوتیں شل اور غلامانہ تصوریت، موہوم امیدوں اور خواہشوں کے سہارے زندہ رہنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتی رہی ہے۔

میر مولاداد کی محبوبہ ایک ایسے دولتمند اور باثروت گھرانے کی خاتون معلوم ہوتی ہے جو جواہرات سے لدی پھندی، خوب رو کنیزوں کے جھرمٹ میں، ماڑی و محلات میں گذر بسر کرتی ہے۔ کیونکہ عام بلوچ معاشرہ میں کسی ایسی خاتون کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور کے بلوچ شعراء نے دورِ متقدمین و متوسطین کی اُس حقیقت بیانی کو جو بلوچی شاعری کا طرۂ امتیاز تھی، ترک کر دیا تھا اور فرضی شہزادیوں یا یوں کہیے کہ دھن دولت اور جاہ و حشم کی پرستش میں لگ گئے تھے۔ ملاحظہ ہو میر مولاداد، اپنی محبوبہ کی تعریف میں کیا کہتا ہے: ؎

ثنائے من گوشتاں جان آفرین ءَ
شہے ماطین، گُنڈ ہپیدہ اسمین ءَ
سمین ءَ، گل رخ ءَ و ماہ جبین ءَ
ترا پوکین دیمی چو ماہِ مُبین ءَ
زنخ زیب، لبی چو انگبین ءَ
بنت شمشاد و لعل شکرین ءَ
ہزار زینت گو رنت اے نازنین ءَ
نہ انت مانندی من رُوی زمین ءَ

یعنی

میں اُس کی ثنا کہتا ہوں جس نے رُوح کو پیدا کیا
دوجہان کے اُس بادشاہ کی ثنا کہتا ہوں
جس نے نسیم سحر کو پیدا کیا۔

اُس گل رُخ، ماہ جبین کو پیار کیا
جو نسیم سحر کی مانند (رُوح افزا) ہے
جس کا دمکتا ہوا چہرہ، چاند کی طرح روشن ہے
جس کی زنخدان خوشنما
اور جس کے ہونٹ شہد کی طرح میٹھے ہیں۔
جس کا قد شمشاد جیسا
اور جس کے عارض گلگوں مٹھاس بھرے ہیں۔
اُس نازنین کی زیبائیاں ہزار ہیں
اُس جیسا رُوئے زمین پر اور کوئی نہیں ہے۔

میر مولاداد کی جولانی طبع، رُکنے میں نہیں آتی، پہاڑی ندی کی تُند و تیز طغیانی کی مانند، بڑے بڑے پتھروں، جھاڑیوں اور رکاوٹوں پر سے اچھلتی، کودتی آگے آگے بڑھتی چلی جارہی ہے۔ اپنے دور کے عام شاعرانہ رواج کے مطابق میر مولاداد بھی اپنی محبوبہ کے خد و خال کی تعریف کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ کہتا ہے :

دپ دنتانی چو دُرتہ قطارنت
دپ آ ماہ جبین ءِ زیبدارنت
چہ مسواک ءِ دورنگی سھور و لالنت
دو چمّی چو شراب ءَ پُر خمارانت
مُدام گوں گوہران مردم شکارانت
شکاری ہر زمان چیہ ءِ ہزارانت
ہزاران گندگ ءِ درا انتظارانت
ہزار اُرشتا تنگ و دل بے قرارانت

ہزار چو قیس و مجنوں دل فگار انت

یعنی

اُس کے دانت موتی کی لڑی کی طرح ایک قطار میں ہیں

جو اُس ماہ جبین کے مُنہ میں

بہت ہی خوش نما لگتے ہیں۔

اُس کے ہونٹ

دنداسہ ملنے سے لعل کی طرح سُرخ ہیں۔

اُس کی آنکھیں

شرابی کی طرح مخمور ہیں۔

وہ اپنے تیرِ نظر سے

مُدام لوگوں کا شکار کیا کرتی ہے۔

ہر وقت، ہزاروں اُس کے تیرِ نظر سے شکار ہو جاتے ہیں۔

ہزاروں دل بے قرار لئے

اُس کے دیدار کے منتظر

کھڑے رہتے ہیں۔

اور ہزاروں، قیس کی طرح دل فگار ہو کر

اُس کے دیوانہ بن چکے ہیں۔

دورِ متاخرین کے اکثر شعرا محبوبہ کے حُسن و جمال، سراپا اور خد و خال کی مدح و ثنا کرنے کے ساتھ ساتھ اُس کے زیور، گہنوں کا بھی نام بنام ذکر کرنا، عشقیہ شاعری میں ضروری بلکہ لابدی سمجھتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اس دور کے ہر شاعر نے زرگر کی دکان میں بیٹھ کر اپنی نظم کہی ہے۔ اس میں بھی میر مولاداد رتیباتی کا پلّہ اُن سب پر بھاری ہے۔ ملاحظہ ہو کس روانی سے کہتا ہے:

بچھیری چمپکلی بندیت ہارءَ
بگوں بچھیں گردنءَ طوقِ طلا را
بگوشاں جھمک و جھالر اوارءَ
دُرنگ و والیاں بندیت قطارءَ
بچو پورءِ زیب دنت گوں شار و ہارءَ
پچوڑءِ انت پلوتی طلاءِ کارین
بدست ءِ مخمل و دستوک اوارین
عجب زردانگاں تنت زیبدارین
بپاداں، پاسے زیب دنت خلخل ءَ را
پری رسم و رواجنت اَج نگارءَ
ہزار انت زیب و زینت دلبرءَ را
ببُرت اَج منے دل ءَ صبر و قرارءَ۔

یعنی

وہ اپنی کونج جیسی گردن میں
چمپاکلی کے نیچے موتیوں کا ہار
اور اُس کے اُوپر طلائی طوق پہنتی ہے۔
اُس کے کانوں میں جھالر دار جُھمکے
بُندوں اور بالیوں کے ساتھ
ایک قطار میں ہوتے ہیں۔
وہ موتیوں کا ہار اور ریشمی دوپٹہ پہنے
مُشتری کیطرح دمکتی ہے۔

اُس کی ناک میں بلاتی تھی
ہاتھوں میں تملّ، دستونگ اور زرد آسنے
اور پاؤں میں خلخال سنگ، پازیب عجب جلوہ دکھاتے ہیں۔
اُس دلبر کے طور و طریقے پریوں کے سے ہیں
اُس دلبر کے زیب و زینت کے ہزار ساماں ہیں
اُس نے ہمارے دل کا صبر و قرار چھین لیا ہے۔

میر مولاداد نے بلوچی میں فارسی کی آمیزش سے نئے معانی پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ بلوچی میں فارسی کے عام فہم اور بلوچستان میں مروّج الفاظ بھی استعمال کئے ہیں۔ اُن دنوں بلوچستان کی تعلیمی اور سرکاری زبان بھی فارسی تھی اس لئے فارسی کی آمیزش نہ صرف ناگوار نہیں گذرتی تھی بلکہ اسے عالمانہ استعداد کا مظہر سمجھا اور پسند کیا جاتا تھا۔ ملک دینار میروانی، ملا فاضل رند اور کئی دوسرے نامی گرامی بلوچ شعراء نے اس قسم کی فارسی آمیز زبان کے استعمال سے بڑی شہرت پائی تھی

میر مولاداد اسی زبان میں اپنی محبوبہ کا سراپا بیان کرتے ہوئے کہتا ہے :-

صنوبر قامت و شیریں ادا ہنت
دلی گوں مہرباں وت بادشاہ انت
گوں زلفاں عنبریں جادو نما انت
دو ہیں گیسوئی چو مارے سیاہ انت
بدام پر خشم بسمل اژدہا انت
وسے برمن اجل بو مہرہ نگاہ انت

---

۱ ۲ ۳ زیورات کے نام

یعنی

میری محبوبہ، صنوبر قامت اور شیریں ادا ہے
وہ اپنی سہیلیوں کی خود بادشاہ[1] ہے
اُس کی سیاہ عنبریں زلفیں سحر انگیز ہیں
اُس کے دونوں گیسو کالے ناگ کی طرح ہیں
اور ہمیشہ اژدہا کی طرح غضبناک رہتے ہیں
لیکن مجھ پر وہ محبت کی نظر رکھتی ہے۔

عموماً لکھے پڑھے تعلیم یافتہ شعراء کی زبان ملاوٹ سے پاک نہیں ہوتی۔ کم از کم بلوچی شعرائے متعلق یہ بات غلط نہیں ہے۔ صاف ستھری اور نکھری ہوئی زبان اُن شعراء کی ہوتی ہے جو عوام سے براہِ راست تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ ہیا ختیہ ٹھیٹ اور روزمرہ کے مطابق ہوتا ہے۔ اُن کی شاعری خداداد صلاحیتوں کا مظہر اور تصنع سے پاک ہوتی ہے۔ وہ اپنے اشعار میں مُلا شاعروں کی طرح دور کی کوڑی لانے کے جتن نہیں کرتے۔ تشبیہات و استعاروں کے لیے مظاہرِ قدرت سے ماوراء الحسی اور ایسی شے کی تلاش نہیں کرتے جو عوام کی سمجھ سے بالاتر ہو۔ ایسے باصلاحیت مگر اَن پڑھ شعراء کے کلام میں جو حُسن اور جاذبیت ہوتی ہے وہ ہمارے مُلا شاعروں کے بناوٹی کلام میں دیکھنے میں نہیں آتی۔ راوت خان جلنبانی ایک ایسا ہی اَن پڑھ شاعر ہے مگر اُس کا کلام دیکھئے کہ اپنی محبوبہ کا سراپا جس خوبصورتی اور جس انداز سے ٹھیٹھ بلوچی الفاظ کے پیکر میں پیش کرتا ہے وہ کس قدر ایک عام بلوچ حسینہ کے مناسبِ حال ہے۔ کہتا ہے:-

دَت ءِ شہجیت چو تیگھ ذوالفقار ءَ
گروکے چیلک ءِ جنت من تہار ءَ
اُئل ہش بوتے، چو دشت ءِ بہار ءَ۔

---

[1] بلوچی میں ملکہ کے لئے بھی بادشاہ بولا جاتا ہے۔ (گ)

سرا گیسوی زمزیرے مچی رچان ءَ
دو دیما کار کنت گہنُو مشان ءِ
چہان زشتہ، بُورہار گوشان ءِ ۔
من ءَ دوست، گپ گد ءَ گہنُو ءَ تار رنت
گج ءَ پیکی سیاہ، ہمرنگ ءَ مار رنت
گُل ءَ پچی من ابروان سار رنت ۔
وتی ہیکان پہ چیلک رُژ کاریت
لسترینیین گردن ءَ گونجی ءَ داریت ۔

یعنی

وہ اپنے کو تیغ ذوالفقار کی طرح
سان چڑھاتی (سنگار کرتی) ہے
وہ ایک بجلی ہے جو تاریکیوں میں کوندتی ہے
(میری) آنچل کی خوشبو ایسی ہے
جیسے دشت و دامان میں آئی ہوئی بہار کی خوشبو ہو ۔
اُس کے گیسو زنجیر کیطرح لٹک رہے ہیں ۔
وہ دو حرف اپنے گیسوؤں پر
(مشک و عبیر) مل رہی ہے ۔
اور ایک دُنیا اُس کے گرد بیٹھی ہوئی
شادی کے ترانے گاتی ہے ۔
ہم کو اِس عنبر افشان محبوبہ کے

ع انمول

گیسوؤں کے ہر ایک تار سے محبت ہے۔
اُس کی چوٹیاں کالی ناگن کی طرح سیاہ ہیں۔
اُس کے ابروؤں کے اُوپر
پھول جیسا ایک سَر بند بندھا ہُوا ہے۔
وہ جب اپنے بالوں کو گوندھ کر سمیٹتی ہے
تو اپنی لمبی گردن کو کونج کی طرح بلند کر لیتی ہے۔

راوت خان بلوچستانی عوام کی زبان بولتا ہے۔ اُس کی محبوبہ بھی ایک عام بادیہ نشین خاتون ہے۔ چاندی کے دو چار معمولی گہنوں کے سوا اُس کے پاس اگر کوئی اور چیز قابلِ ستائش ہے تو وہ اُس کا خداداد حسن ہے۔ راوت خان حسن کا شیدائی ہے۔ اپنی محبوبہ کی تعریف کرتے ہوئے راوت خان کہتا ہے:-

پُنڑمی، سیم کش و سیم گھنڈ نفتہ ہانی
اَنیشگ مسل ماہِ چارد ہانی۔
گل و بُروان اچ نوک و سران نت
گل و گی و چیڑ اَبریشانی
دو میں چمّی، گر تشئے آہو پران نت۔
مچا چانی حساب نہتیت درجبین ء
جہان گندیت و کُر شتیت گمتمین ء۔
کُرشاں چینے کہ چمّی و زراں
گل و صُورت اِنت شَرتر نواں۔

ی

ری محبوبہ کی، پنڑمی بشیکش اور سیم گھنڈ چاندی کے ہیں

اُس کا دوپٹہ اور اُس کی قمیص ریشم کی ہے۔

اُس کی پیشانی

چودھویں کے چاند کی طرح دمک رہی ہے

اُس گل رُو کے ابرو ہلال جیسے

اور اُس کی آنکھیں

یُوں کہو کہ ہرنی کی آنکھیں چمک رہی ہیں۔

اُس کی آنکھوں پہ

پلکوں کی زیبائش کی تعریف ممکن نہیں۔

ایک جہان، اُنہیں دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے۔

میں نہیں جانتا کہ

اُس کی اور کیا تعریف کروں!

ممکن ہے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے

اُمل اُس سے بھی زیادہ حسین ہو۔

بلوچ مُلّاؤں نے اگرچہ بلوچی شاعری میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے اور اُسے نئے
نئے نئے محاورے، اصطلاحات اور وسعتیں بخشی ہیں لیکن انہوں نے زبان کو گنجلک
مشکل بنانے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ مُلّا بوہیر بیسرانی اسی عہدِ فکر کا ایک نام
گزرا ہے۔ اُس کی زبان بعض لفظی بندشوں کے علاوہ بلوچستان میں اُس دور کی مروّج
ہوتی ہے۔ مُلّا بوہیر اپنی محبوبہ کے سراپا کو زیبِ داستان بنا کر کہتا ہے: ؎

دیستوں گُلِ گلستان ہمراہِ دختران

گیسو کہ وتتارنت، بامسک و زعفران

رکشیت چو ماہِ تابان، گوں تہبت و زیوران

آ لیلی انت صد ناز ، مجنون من در وراں ۔

یعنی

میں نے لڑکیوں کے ساتھ

گلستان کا ایک پھول دیکھا

اُس کے گھونگریالے کالے گیسو

مُشک و زعفران سے معطر تھے ۔

وہ زیور ، گہنوں میں

ماہِ تاباں کی طرح دِکھتی تھی ۔

بیشک ، وہ صد نازوں والی لیلیٰ مثال ہے ۔

اور مَیں مجنوں مثال ۔

یہاں پر اِس امر کی وضاحت مُناسب معلوم ہوتی ہے کہ لفظ مُلّا ۔ اُن دنوں بلوچ معاشرہ میں ...پہ موذن اور مسجد کے پیش امام کے معنی میں بھی بولا جاتا تھا لیکن عام طور پر اِس کے معنی لکھے پڑھے کے ...تے ہیں ۔ ہر لکھے پڑھے شخص کو مُلّا بولا جاتا تھا ۔ تو ہیرسیہ وانی بھی چونکہ ایک خواندہ شخص تھا اس لئے مُلّا ...ہور تھا اور مُلّا ہونے کے ناطے سے بلوچی اشعار میں فارسی الفاظ کے بے دھڑک استعمال کو اپنا حق ...جائز سمجھتا تھا ۔ کہتا ہے :-

شہ گام کبک و دُرّاج ، لذّیت دُر بشر

مانند سرو و شمشاد ، محبُوب دُر حبر

رُوان روّنت بقفار ، پہ شان و زیب و فر

چم کپل و خمارنت ، پر کیبت و مُستتر

مینی چو شیشہ چین ، زیبا تیں لب شکر

دپ تنگ و دُرج و یاقوت ، دنداں چو سیم و زر

گُل غنچہ تنت دو پستان ، اشجارِ پُر ثمر

دوست اِنت من عُریری رنگ ، صد جان و صد جگر

اُشی چاہِ بابلِ آن ، مارانہ بیت خطر

مَن دردمند استوں اَج عشقِ اوبَتر۔

یعنی

وہ اِنسانوں کی موتی

چکور اور دراج کیطرح خراماں تھی

وہ دُرگفتار بھی تھی اور سرو و شمشاد کیطرح سر بلند بھی۔

اُس کے اَبرُو ،

عجب شان سے

ایک قطار میں صف بستہ تھے

اُس کی کاجل بھری آنکھیں

ایسی خُمار آگیں تھیں جیسے

اُس نے کہیں چھپ کر شراب پی ہو۔

اُس کی ناک شیشۂ چین کی مانند

اور اُس کے ہونٹ خوبصورت اور شہد سے بھرے تھے۔

اُس کا دہن تنگ

ہونٹ ، دُرِ دَرج و یاقوت کی طرح سُرخ

اور دندان سیم و زر کی مانند (سفید) تھے۔

اور پری چہرہ

سو جان اور سو جگر سے مجھے پیاری ہے۔

Scanned with CamScanner

وہ ایک میوہ دار درخت کیطرح تھی۔
اُس کے دونوں پستان غنچۂ گُل کی مانند تھے۔
مجھے اُس کے چاہِ بابل[1] میں گرفتار ہونے کا کوئی ڈر نہیں۔
میں اُس کے عشق میں
بُری طرح سے مُبتلا ہو چکا ہُوں۔

---

[1] چاہِ زنخ۔ زنخدان

Scanned with CamScanner

(۲)

ہجر و فراق کی کیفیت کے بیان میں

بلوچی شاعری کا ایک بہت بڑا حصہ ہجر و فراق کی کیفیت کے بیان میں ملتا ہے۔ دوسرے شعرا کے مرثیہ، جام دُرک اور توکلی مست کی نظمیں غزل میں جو رنگ جما دیتی ہیں اُن کی نظیر دوسرے شعرا کے کلام میں بہت کم ملتی ہے۔ فراقیہ شعر گوئی میں بلوچ شاعر اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔ بسا اوقات طول کے تاثر سے ایسے نکتے اپنے اشعار میں پیدا کر دیتے ہیں کہ دل میں ایک ہُوک سی اُٹھتی معلوم ہوتی ہے۔ سامعین پھڑک اُٹھتے ہیں اور ان پر ایک ایسی بیخودی اور وارفتگی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

بلوچ شاعر اپنی سیدھی سادی زبان میں بیساختہ اپنے دکھ درد کا اظہار کرتا ہے۔ جو لوگ اشعار میں گہرائی اور پھیلاؤ دیکھنا پسند کرتے ہیں اُن کے لیے ممکن ہے بلوچی شاعری میں کوئی خاص کشش نہ ہو لیکن ایک سادہ دل اور بادیہ نشین بلوچ، جو حسن فطرت کا شیدائی ہوتا ہے اِن پر جان چھڑکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صدیاں گذر جانے کے باوجود قدیم شعراء کا کلام اُن کو اس طرح از بر رہتا ہے جیسا کہ کل رات شاعر نے طنبورے کی لے پر یہ نظم اُن کو غزل میں گا کر سنائی ہو۔ زبان کی سادگی اور سلاست کے علاوہ اس کی دُوسری وجہ یہ ہے کہ شاعر بلوچ عوام کے ذہن کے مطابق بات کرتا ہے جو آسانی سے اُس کی سمجھ میں آ جاتی ہے اور دل پر نقش ہو جاتی ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ میر چاکر رند (پندرھویں صدی) کے عہد سے لیکر آج تک بلوچ معاشرہ میں کوئی خاص اور نمایاں تبدیلی نہیں آئی ہے۔ وہی خانہ بدوشانہ زندگی، وہی بھیڑ بکریوں کے ریوڑ، اُونٹوں کے گلّے اور چراگاہوں کی تلاش، ذہن کے وہی انداز اور وہی کیفیتیں جو صدیوں پہلے

خواتین کے زیبِ تن رہتا تھا، آج بھی تقریباً اُسی قطع و بُرید کے ساتھ موجود ہے اس لئے اُس قدیم دور کے شاعروں کا کلام بلوچ کے لئے حضرت داؤد کے اشعار کی طرح ماقبل التاریخ آثار کا ذخیرہ نہیں ہوتا بلکہ اسی دور اور زمانے کے بلوچ معاشرہ کا پرتو ہوتا ہے۔ اُس میں اجنبیت نہیں بلکہ اپنائیت ہوتی ہے بُعد نہیں بلکہ قُرب ہوتا ہے اور اسی چیز نے قدیم بلوچی شعراء کے کلام کو اب تک بلوچ کے دل میں ترو تازہ رکھا ہے۔

دورِ متقدمین کے شعراء میں بی بگر رند کا اپنا ایک خاص اور بلند مقام ہے۔ اُس کی شاعری رزمیہ و بزمیہ ہر دو اصناف میں دل نشین و متاثر کن ہے۔ اپنی ایک عشقیہ نظم میں اپنی محبوبہ کو یاد کر کے بیبگر کہتا ہے:۔

دل پہ آروستیاں زہیرہ بیتہ
گنتیت پہ آسیا ہمار چو تُرُنگ جہدان
نیم شپی گنفس و آ ہستگیں جبیان

یعنی

میرا دل اُس محبوب کی یاد میں تڑپ رہا ہے
اُس کالے ناگ جیسے گیسوؤں والی کی یاد
مجھے ستاتی رہتی ہے۔
اُس کی وہ ادائیں جب کہ،
آدھی رات کی محفلوں میں
بات بات پہ وہ ہنستی
اور ہنس ہنس کر پیار سے مجھے 'جی' کہتی
یاد آکر
مجھے تڑپا دیتی ہیں۔

Scanned with CamScanner

تُلّی نامی ایک جتنی[1] سے بی بگر کو بڑا پیار تھا لیکن وہ اچانک اُس سے بچھڑ گئی مگر اُس کی یاد کو اپنے دِل سے نہیں نکال سکا۔ چنانچہ کہتا ہے: ے

بازیہ تُلّی ءِ وَرَے دردان
ہر دو ہیں دستاں گَنڈگاں دارے
گندے تُلّی ءِ باندء ُ وہند ءُ۔

یعنی

(اے بی بگر)!
تم اب تُلّی کے فراق میں بہت درد جھیلو گے
جب تم اُس کے خیمے کی جگہ پر
پتھروں کے اُس چبوترے کو دیکھو گے
(جن پر تُلّی اپنا سامان رکھا کرتی تھی)

تو دونوں ہاتھوں سے
اپنے گُردے پکڑ کر فریاد کرو گے۔

حمّل جیئند، بلوچوں کے ہوت قبیلے کا ایک نامی گرامی سردار گذرا ہے۔ ایک زمانے میں کراچی سے بندرِ عباس تک بلوچستان کا تمام ساحلی علاقہ اُس کے قبیلے کے زیرِ تصرف تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پُرتگیزی بحری قزاقوں نے خلیج تک بحیرۂ عرب کو اپنی لوٹ مار کی آماجگاہ بنا رکھا تھا۔ سردار حمّل بن جیئند نے ان پُرتگیزی بحری قزاقوں سے کئی بحری لڑائیاں لڑیں آخر کار، پُرتگیزوں نے اُسے ایک لڑائی میں شکست دے کر گرفتار کر لیا اور ازاں بعد موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

حمّل جیئند کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ایک انتہائی بہادر، عاشق مزاج اور بانکا جوان تھا۔

---

[1] اُونٹ چرانے والے جت قبیلے کی عورت۔ الخ

ے مختلف علاقوں میں اُس کی معشوقائیں رہتی تھیں۔ ایک نظم میں خود اُن کی تعداد سات بتلاتا ل چاہتا کسی ایک معشوقہ کے پاس چلا جاتا اور اس طرح وہ عشقیہ نظمیں جنم لیتی رہیں جو آج تک عام ہیں اور جن میں حمل جیئند کا کردار درخشندہ و تابندہ ہے۔

حمل جیئند کی ایک معشوقہ تُس بیلہ میں تھی۔ ایک مدت تک جب حمل اُس کی ملاقات کو نہ جا سکے ت پریشان ہوتی۔ ایک دن جب ایک فال بین (دست شناس) عورت اُس کے گھر آئی تو نے حمل سے متعلق اُسے فال نکالنے کو کہا۔ اِس واقعہ کو اپنی مشہور نظم "شیر شکاری" میں حمل خود بیان ہوئے کہتا ہے: ے

دست جنت سیاہین گو الگ ءِ دھاماں
بارتی گورزدسگند ءِ جنانی ءَ ؛
زیت کن اُو دسگند ! اگندمنی دست ءَ
گندمنی دست ءَ و دیے من ءَ حال ءَ ؛
دیرگتہ ہوتین حمل ءِ تیگہ ءَ۔
نے وتَ کپیت ، نے ماہر دِکے شستی
نے دپ ءِ ہنبو تیں سلاے کپیت۔

یعنی

کالے جوال میں ہاتھ ڈال کر
فال گندم نکالتی ہے
پھر اُن کو لے جاکر
رتوں کے ہاتھ دیکھنے والی دست شناس عورت کو دیتی ہے۔

جنانی عورتیں ۔ ٰ۲ ہاتھوں کی لکیریں پڑھنے والی

اے دست شناس جلدی کر

میرا ہاتھ دیکھ

میرا ہاتھ دیکھ کر مجھے یہ بتا دے

کہ شیر زن حمل نے (اس دفعہ) آنے میں دیر کیوں لگا دی

نہ تو وہ خود آتا ہے

نہ اپنا کوئی قاصد بھیجتا ہے

اور نہ ہی کسی راہرو کے ذریعے

اپنا سلام بھیجتا ہے۔

حمل نے اپنی نظم میں اُس وقت کے بلوچ معاشرہ کی بڑی سادگی سے صحیح تصویر کھینچی ہے
اگر غور سے دیکھا جائے آج بھی ہمارا خانہ بدوش معاشرہ اُسی ڈگر پر چل رہا ہے۔ گھر میں نقد رقم نہیں
ہوتی، خرید و فروخت اجناس کے تبادلے کی صورت میں ہوتی ہے۔ دست شناس حرافہ کو، عوض
تھیلے سے غلہ گندم نکال کر دیا جاتا ہے۔ دست شناس کا جواب سُن کر حمل کی محبوبہ کا دل بھر آتا
دونوں ہاتھ بددعا کے لئے اوپر اُٹھا کر کہتی ہے: ؎

بِزدی چہ براتی میٹروان رنج بات

بمبوین دوست ءِ راوُرات مارشے

دستی اَج مالی لیکوان بند بات

بلے لاگھر وکنگالیں کُسیت گوش بات

یعنی

(خدا کرے کہ)

بھائیوں کی مجلس سے اُس (حمل) کا دل بھر جائے

اُس کی گھنیرے گیسوؤں والی محبوبہ کو

سانپ ڈس لے۔
اور مال و زر کے حساب سے
اُس کا ہاتھ رُک جائے۔
لیکن اُس کا دُبلا اور کمزور گھوڑا
موٹا تازہ اور چاک و چوبند ہے۔

بلوچی کی عشقیہ شاعری میں شئے مُرید کا مقام بہت بلند ہے۔ بلوچ اُسے عاشقوں کا سرتاج مانتے ہیں۔ اُن کے خیال میں ؎

تاجہان است ، شئے مُرید مست است

یعنی جب تک جہان ہے شئے مُرید مست الست یعنی زندہ و سلامت ہے۔ گویا کہ بلوچوں نے شئے مُرید کو اگر ایک طرف عاشقوں کے بادشاہ یعنی عربوں کے قیس کا مقام دیا ہے تو دُوسری طرف اُسے خضر علیہ السلام کا ہمپایہ قرار دیا ہے۔ شئے مُرید و ہانی کی داستانِ عشق دراصل ایک بلوچ سردار اور ایک آزادی پسند بلوچ نوجوان کے درمیان کشمکش کا ایک المیہ ہے۔ سردار میر چاکر رند، چیلوں بہانوں سے، شئے مُرید کی محبوبہ اور منگیتر ہانی کو ہتھیا لیتا ہے۔ شئے مُرید، سردار چاکر سے ٹکر لینے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ قہرِ درویش بہ جانِ درویش، تارک الدُنیا ہو کر درویشوں کے ایک گروہ کے ساتھ حج بیت اللہ کو چلا جاتا ہے۔ ایک روایت کے مطابق پچیس سال اور دوسری کے مطابق پانچ سال مکہ معظمہ میں بسر کرنے کے بعد جب واپس بلوچستان آتا ہے تو وہ دُنیا سے بے نیاز، ایک خدا رسیدہ، مست ملنگ کے درجے پر پہنچا ہوا ہوتا ہے اور روایت کے مطابق بلوچستان کی وادیوں اور صحراؤں میں ایک سفید سانڈنی پر سوار، اپنے زورِ باطن سے اُڑتا پھرتا ہے اور قیامت کے دن تک اسی طرح اُڑتا پھرتا رہیگا۔

کہتے ہیں کہ شئے مُرید نے مکہ معظمہ میں رہ کر پچپن ۵۵ نظمیں ہانی کے فراق میں کہی تھیں انہی میں سے ایک نظم میں کہتا ہے : ؎

شپ کہ چار پاس اِنت، ہنگل وا اُومان اِنت من ءَ
نیم شپی پاسان ہمدیں بیلوں جُست کنت،
شے ترا پچے اِنت زیادگیں اُپتاراں جنے
من شپی پاساں نالگ وپر یادِنت ترا۔
اومنی پراتاں! من گھمزدی بارے گپتگان
نے جُبتش زرینت دنے دود ناتش چست کنت
لیٹرہ اِشں چتریں پہ دلے ناکامیں بُرنت
آ ہمنی پلگنت گوں منی بالادءَ جُڑنت
جیل وزمیں رینت ہمنی گُٹ ءَ کپتگنت
چاکرءِ پہناتی من ءَ کمارے جتگ
اَچ دل ءِ بنداں، اُوداں چہ پُشت ءَ درشتگ
تازگنت ٹپیش حون پلکاں تنت اَچ وپ ءَ
ٹپ منی بازنت گوں طبیباں دُراح نہ بنت
ٹپ منی بازنت مرہم ودارُوگی نہ منت
ٹپ منی سر پوشنت، گنگبارین دردے کننت
ٹیانی درمان بانی ءِ پھلیں کھندگ منت
تیل وزہینگش آمزیں کھنڈیں سنگبو منت۔

یعنی

رات کے چاروں پہر
میں چیخنے، چلانے اور دردِ فراق میں بسر کرتا ہوں۔
آدھی راتوں کو سیر کرو دوستا در ساتھی

مجھ سے پوچھتے ہیں :

اے شہ مُرید ! تجھے کیا ہو گیا ہے

کہ اس قدر زیادہ سرد آہیں بھرتے ہو

اور رات بھر نالہ و فریاد کیا کرتے ہو ؟

اے میرے بھائیو :

میں نے غموں کا ایک سنگین بار خریدا ہے

جسے نہ تو اُونٹنیاں اُٹھا سکتی ہیں

اور نہ ہی دو سالہ اُونٹ -

بلکہ پُوری عمر کے سانڈ بھی

بمشکل اسے اُٹھا سکتے ہوں -

یہ غم

لوہے کے ایسے تختے ہیں

جو میرے جسم میں پیوست ہو چکے ہیں ،

اور لوہے کی زنجیریں ہیں

جو میری گردن میں پڑ چکی ہیں -

(میر) جاکر نے ترچھا وار کر کے

مجھے ایک ایسی کٹار گھونپ دی ہے

جو میرے دل میں لگ کر

دُوسری طرف میری پیٹھ سے باہر نکلی ہے -

میرے زخم تازہ ہیں

Scanned with CamScanner

میرے مُنہ سے باہر نکلتا ہے۔

میرے زخم بہت ہیں

اور اِس قسم کے ہیں کہ طبیب اُن کا علاج نہیں کر سکتے۔

میرے زخم بہت ہیں

اور ایسے ہیں کہ اُن کے لئے مرہم و درمان کوئی نہیں۔

میرے زخم پوشیدہ ہیں

اور اُن سے ہلکی ہلکی ٹیسیں اُٹھتی ہیں۔

میرے زخموں کا علاج

صرف ہانی کی پھول جیسی ہتھیلی ہو سکتی ہے

اور اُن پر تیل و مرہم

صرف ہانی کے دندانے دار کنگنوں والے ہاتھ لگا سکتے ہیں۔

شئے مُرید ایک دفعہ کبوتر کے ذریعہ ہانی کو پیغام بھیجتا ہے۔ شئے مُرید اپنے

قاصد کبوتر سے کہتا ہے کہ جب تم ہانی کو میرا پیغام سناؤ گے تو :-

ارسش گانت مِن اَچ ہما آسکی دیدگان

اَچ ادا بال کن نند مِس گیوار ءِ دپ ءَ

نُقرہ ءِ مین مُشت ءِ چیر بدار ارسانش بگر

ارسانش مُشتے کہ بدا اگیں دیبائی رچنت

ارسانش مُشتے کہ تے گلءِ آزاپ ءَ دیتنت۔

یعنی

اب اُس کی غزالی آنکھوں میں آنسو بھر آئیں گے۔

وہاں سے اُڑ کر

تو اُس کی مانگ کے اُوپر بیٹھ جا

اور، اپنی نقرئی منقار سے

اُس کے آنسوؤں کو پکڑ تا جا۔

ان گرم آنسوؤں کو مت چھوڑنا کہ

اُس کے عارضِ گلگوں پر گریں۔

آنسوؤں کو مت چھوڑنا کہ

میری پھول جیسی محبوبہ کو کوئی آزار پہنچا ئیں۔

شے مُرید جب ہانی کے عشق میں دیوانہ ہُوا تو اُس کی دیوانگی دیکھ کر عزیز و اقارب نے سمجھا کہ شاید اُس پر کسی جن بھُوت کا سایہ پڑا ہے۔ اِس لئے اُنہوں نے فقیروں ملاؤں اور درویشوں کو جمع کیا کہ دم پھُونک سے اُس کا علاج کریں لیکن مُرید کو جب پتہ لگا تو اُس نے اُن کو سمجھایا کہ مرضِ عشق کا علاج نہ طبیبوں کے پاس ہے اور نہ ہی فقیروں اور ملاؤں کے بس میں۔ ملاحظہ ہو کہتا ہے :-

ٹہوں طبیب درمان نہ کنت

جنوں پچیر نئے گار کنت

وانگو کہ دوست دستءَ گیرت

مں گور گیں گھلءَ مبارت

وشیں حدیسانی مدنت

عشق ءِ گنوک دُراح نہ بیت

یعنی

طبیب میرے زخموں کا علاج نہیں کر سکتے

اور نہ ہی کوئی فقیر میرے جنات کو مار کر نکال سکتا ہے۔

جب تک کہ محبوبہ اپنے محبوب کا ہاتھ نہ پکڑے

ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنے سفید خیمے میں نہ لے جائے

اور وہاں بیٹھ کر اُس سے میٹھی میٹھی باتیں نہ کرے

تب تک عشق کا دیوانہ صحت یاب نہیں ہو سکتا۔

کہتے ہیں کہ کئی سال مکہ معظمہ میں بسر کرنے کے بعد شئے مُرید افغانستان

اور بلوچستان کے حاجی درویشوں کے ایک گروہ کے ساتھ واپس آیا۔ ساحل پہ اُتر کر وہ سیدھا

ہانی کے پاس گیا اور اُس کے خیمے کے سامنے بھیک مانگنے کے بہانے کھڑے ہو کر درویشانہ

صدا لگائی۔ ہانی اس کی آواز سُنتے ہی خیمے سے باہر آئی لیکن اُسے پہچان نہ سکی البتہ اتنا سمجھ لیا کہ

وہ ایک حاجی درویش ہے جو ابھی ابھی مکہ معظمہ سے واپس آیا ہے اس لئے اُس سے پوچھا کہ اے

درویش! تم جو مکہ معظمہ سے آرہے ہو آیا تم نے وہاں پہ شئے مُرید نام کا کوئی اپنے جیسا درویش دیکھا

ہے؟ شئے مُرید نے جواب دیا: ۔

شئے ءَ کس ترا سوج ءَ دنت

مستاگ ءَ دیے تو چیئے؟

یعنی

اگر کوئی شخص تم کو شئے مُرید کا پتہ بتا دے

تو تم اُسے

خوش خبری سُنانے کا انعام کیا دو گی۔

اب ملاحظہ ہو کہ وہ متوالی، ایثار و قربانی کا پیکر ہانی کس اندازِ بیخودی

و بے اختیاری سے اُس کے جواب میں کہتی ہے: ۔

گوشتاں پہ دل ءَ ارمان ءَ

گوش ءَ گوانزلوکیں دُراں

کنڈیگ ءِ کمانٹ بہا آئیں ءَ
پوز ءِ پُلگ دگرا زبگان
دست ءِ سنگہاں سیبیگیں
پاد ءِ مار سریں پادینکان
کُنڈ گوں سی ہزاریں گنجان
چاکر گوں سلاح وسنجان
بیج گوں گوازگ ءِ شاگیں ءَ
جان ءِ جامگ ءِ زریں ءَ
انگت سر منی قُربان انت ۔

یعنی

میں (ہانی) نے حسرت بھرے دل سے
اُسے جواب دیا کہ :
اپنے کانوں کے جھولنے والے جھمکے
ایک جوان اُونٹ کی قیمت کا
اپنا گلوبند ۔
ناک کی نتھ اور بولے
سیپی کے بنے ہوئے اپنے ہاتھوں کے کنگن
سانپ کے سروں والے اپنے پاؤں کے جھانجھن
اپنا خیمہ
تیس ہزار روپے کے اثاثے کے ساتھ ۔
میر چاکر کو بھی

اُس کے ہتھیاروں اور سروسامان کے ساتھ

اپنے بیٹے کو ریشم کے گہوارے کے ساتھ

اپنے پہننے کے تمام نرم ریشمی ملبوسات

اور اِن سب کے علاوہ

اپنا سر بھی اُس پر قربان کردوں گی۔

عاشق جب اُن حدود کو جو عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی کے درمیان ہیں پار کر لیتا ہے تب وہ دنیوی لذتوں کی کشش اور رغبتوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ وہ ایک مقام پہ پہنچتا ہے جہاں سے دُنیا کی ہر شے اُسے ہیچ نظر آتی ہے۔ شے مُرید نے جب وہ مق تو پھر ہانی کے پاس اُس کا پلٹ کر آنا ممکن نہ تھا۔ ہانی نے اپنی طرف سے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح اُسے پھر اپنے پاس بُلا لے مگر وہ اب ایک ایسے مقام پہ پہنچ چکا تھا جہاں سے واپ تھی۔ اُس نے ہانی کو کہلا بھیجا :-

من نہیاں اُو سُومری پھگاں مکن

من تئی لڈّانی پداگیاں پیتگاں

من تئی بے سیتیں سلامان دیر آگہان

پادوں نعل بستگ پہ ڈگارانی درگتان

چمّوں حون مستگ پہ شپانی بے وابیان

چون تتریگاں پہ زرد آپیگ نہ بان۔

یعنی

اے حسینہ! اب میں نہیں آؤں گا

مجھے اپنے پیغام نہ بھیج

بہت عرصے سے

میں تمہارے سلاموں کے بیفائدہ ہونے سے
آگاہ ہو چکا ہوں۔
میں تیرے لئے
بیابانوں میں منزل بمنزل بھٹکتا رہا ہوں۔
سنگلاخ وادیوں میں بھٹکتے بھٹکتے
میرے پاؤں (گھوڑے کے) سُموں کی طرح سخت ہو چکے ہیں۔
راتوں کی بے خوابی سے
میری آنکھوں میں خون جم چکا ہے
میں اب ایسا پیاسا ہوں
کہ سمندر کو پی کر بھی سیراب نہیں ہو سکوں گا۔

صُوفیائے کرام کہتے ہیں کہ فنافی الذات ہونے کی صُورت میں دوئی کا
ٹ جاتا ہے ہر چیز میں محبُوب ہی محبُوب کا جلوہ نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شئے مُرید
کہ میں بھی مانی ہی کی خوشبُو آتی ہے اور وہ کیف وسُرور کے عالم میں چیخ اُٹھتا ہے کہ :ے

دوشی سمیں ءِ شبانگ
اچ مکران ءِ نیمگ ءَ
یانی زباد بوئیں من ءَ
ہنیلیت مس بالگھیں مخہ ءَ

بھی

ت مکران کی طرف سے
سم سکتی ہوئی
ت : دو... ادے معطر بالی

خوشبو ... ہو ... خوامن خود ... ہیں

Scanned with CamScanner

مجھے باغوں والے محلے میں بھی چین سے رہنے نہیں دیتی۔

بلوچ من حیث القوم اب تک ایک بادیہ نشین اور خانہ بدوش قوم ہے
مال دار لوگ چراگاہوں کی تلاش میں وادیوں اور صحراؤں میں مارے مارے پھرتے ہیں کسی وادی میں
کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد جب وہاں سے نقل مکانی کر جاتے ہیں تو پتھروں کے کچھ ڈھیر، خیموں کی
چند ٹوٹی پھوٹی طنابیں، مٹی کے ٹوٹے ہوئے برتنوں کے کچھ ٹھیکرے وہاں پڑے رہتے ہیں۔
بلوچی اصطلاح میں اس جگہ کو ہنکین کہتے ہیں۔ محبوبہ کی ہنکین بلوچی شعراء کا پسندیدہ موضوع سخن
رہی ہے۔ جام دُرک، توکلی مست اور دوسرے کئی نامی گرامی بلوچی شعراء نے اس موضوع پر بہت
سی عمدہ نظمیں کہی ہیں۔ یہی موضوع ہجر و فراق کے اظہار کے لئے ایک وسیع میدان رکھتا ہے
ریحان رند نے بڑی دلکش بات پیدا کی ہے۔ کہتا ہے :۔

صبحی شکارءَ رپتگان
اَچ کوہ بُنے مان گوستگان
ہنکین ءَ لعل ءِ دیستگان؛
ہنکین و دیری تیں ہُبنند
دیتگ من و گریتگ دِل ءِ
گریتگ دِل ءَ داں وَندھی
اَنزی من حونی گریستگان۔

یعنی
کل صبح میں شکار کو گیا
ایک پہاڑ کے دامن سے گُزرا
وہاں پر میں نے
اپنی محبوبہ کی قیام گاہ کے پُرانے نشان دیکھے

جہاں پر کبھی اُس کا ڈیرا ہوا کرتا تھا۔
میں نے وہ نشان دیکھے
اور میرا دل رونے لگا۔
میرا دل اُس وقت تک روتا رہا
جب تک کہ
میں نے خون کے آنسو نہیں بہائے

ملک دینار عبداللہ خان میروانی اسی موضوع پر کہتا ہے:

من گُل ءُ غمگین ءُ بہ ءُ چاران
اندوھے زیاتین بر دل ءُ داران
بازوتی ھہلیج ءُ دل ءُ کاران۔

یعنی

جب میں اپنی محبوبہ کی قیام گاہ کو
جہاں وہ رہتی تھی
دیکھتا ہوں، تو
بہت زیادہ غمگین ہو جاتا ہوں
اُس وقت وہ ھہلیج[1] مجھے بہت یاد آتی ہے۔

توکلی مست نے اس موضوع کو بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے۔ اس نسبت سے اُس نے جو اشعار کہے ہیں اُن میں ایک عاشقِ صادق، ایک شاعرِ وارفتہ کے والہانہ جذبات و احساسات کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ کہتا ہے:

جڑ کال روشتے تہ ڈلی وہ۔ اڑکگاں

---

[1] ھہلیج۔ اندھیری راتوں کو روشن کرنے والی یعنی محبوبہ۔

Scanned with CamScanner

کاخت روکوشتان سمّو ءِ کوریں بانڈوءَ

سنگ نہ گالائنت ، باز نشں وڈریں بانگان

چلمو ءِ زیراں من دل ءِ بندان ایر کنان

سمّل ءِ کوریں بانڈوءَ ، ہوناں لعل کنان ۔

یعنی

ایک دن گھومتے پھرتے

میں پہاڑ کے دامن میں جا پہنچتا ہوں

اور سمّو کے خیمے کی جگہ (ہنکین) پر

پڑے ہوئے پتھروں کے ڈھیر پہ آکر

ٹھہر جاتا ہوں ۔

پتھر

خیمے کی موتیوں جیسی مالکن کی بات

مجھ سے نہیں کرتے

دل چاہتا ہے کہ

کنار اٹھا کر اپنے دل میں گھونپ دوں ۔

اور سمّو کے خیمے کے پتھروں کے اس ڈھیر کو

اپنے خون سے سُرخ کر دوں ۔

لیلےٰ ، مجنوں کی داستان اگرچہ عربستان اور عربوں سے متعلق ہے لیکن
بلوچ اُسے اپنے رنگ میں پیش کرتے ہیں ۔ ملک الشعرا جام دُرّک نے لیلےٰ ، مجنوں کی جو داستان
بلوچی میں منظوم کی ہے ۔ اس سے ایسا لگتا ہے کہ لیلےٰ ایک خانہ بدوش مال دار بلوچ کی بیٹی تھی جس

ا۔ جھیڑ بزہ ، بے مارے

پر مجنا نامی ایک بلوچ نوجوان عاشق ہو گیا۔ چراگاہوں کی تلاش میں جہاں جہاں لیلے کا خانہ بدوش قبیلہ چلا جاتا، مجنا بھی اُن کے پیچھے پیچھے چلا جاتا تھا۔ ایک دفعہ جبکہ مجنا، لیلے کی محمل کے ساتھ چل رہا تھا کہ لیلے نے اپنے کتے کو "دُور باش" یعنی "ہٹ جاؤ" کہا۔ مجنا نے اُس کی بات سُن لی اور وہاں پر ہی ٹھہر گیا۔ رفتہ رفتہ جنگلی بیلوں اور جھاڑیوں نے اُسے سر سے پاؤں تک ڈھک لیا۔ اگلے موسم میں جب لیلی کے قبیلے نے پھر آ کر وہاں ڈیرہ ڈالا تو مجنا اسیطرح ایک درخت کی صورت میں بیلوں اور جھاڑیوں میں ڈھکا کھڑا تھا۔ ایک دن قبیلے کا ترکھان لکڑی کاٹنے جنگل کو چلا۔ اُس نے درخت کا ایک اُونچا تنا دیکھا اور اُسے کاٹنا چاہا۔ جب پہلی کلہاڑی چلائی تو درخت کے اُس تنے سے آواز آئی کہ "اے ترکھان! میں کسی درخت کا تنا نہیں ہوں بلکہ مجنا ہوں جو لیلے کے کہنے پر یہاں کھڑا ہوں۔ ترکھان کانپ گیا۔ ڈر سے اُس کے دانت بجنے لگے۔ بھاگم بھاگ لیلی کے پاس گیا اور اُسے سارا ماجرا کہہ سُنایا۔ لیلی ننگے سر اور ننگے پاؤں دوڑتی ہوئی آئی اور مجنا پر سے جنگلی جھاڑیوں اور بیلوں کو ہٹانے لگی۔ جام دُرک کہتا ہے کہ اُس وقت مجنا نے لیلے سے کہا: ؎

دُلانوں سَند اُو جانی !

اَج تو نیکی اِنت دُلانی

شَب بیت چلگ دیپان سَنت

روج ءِ چو تمین ءِ سائنت

تو دوستانی دِل ءِ توک ءِ بیے

کُٹ دھیل د بوپٹ بیے ؎

یعنی

اے جانی !

اِن بیلوں کو توڑ کر مجھ سے نہ ہٹا

یہ بیلیں تو تجھ سے زیادہ مجھ پہ مہربان ہیں

جب موسم سرما کی سرد راتیں آتی ہیں

تو یہ مجھے پناہ دے کر سردی سے بچاتی ہیں

اور گرمیوں کے دنوں میں

بادلوں کی طرح مجھ پر سایہ کرتی ہیں

جبکہ تم

اپنے دوستوں کے دل میں رہتی ہو،

چارپائی پہ

مخمل جیسے نرم گدیلوں پہ سوتی ہو۔

فراق یار میں دل پہ جو کیفیت گذرتی ہے چہرے پہ اس کی جھلک نظر آتی ہے۔ جام درک اپنی محبوبہ کو غمگین دیکھ کر اس سے پوچھتا ہے کہ اے

پرچے کُلکیت کوردیم تنت

صورت مُنگ و نلین تنت

بیکیت مبوین و ضرین تنت

جھبت کدہ تمین ازین تنت

یعنی،

اے محبوبہ!

تیری گھونگھریالی زلفیں

کیوں کتاب و پریشان ہیں۔

تیرے طلائی زیور

کیوں میلے پڑ گئے ہیں

تیرے گھنے گیسوؤں پر
کیوں گرد جم گئی ہے۔
اور تیری کٹوروں جیسی آنکھیں
کیوں اشکبار ہیں۔

بلوچی شاعری میں جام دُرّک وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے بلوچی شاعری میں حُسن وعشق کی تصوراتی کیفیتوں کا بیان کیا ہے۔ اُس کے بعد اب تک بلوچی کا کوئی ایسا شاعر پیدا نہیں ہوا ہے جو اِس میدان میں جام دُرّک کی ہمسری کا دعویٰ کر سکے۔ عشقیہ نظمیں کہنے والے ہر دور کے بلوچی شعراء زیادہ سے زیادہ اپنی نظموں میں محبوبہ کے سراپا کی تعریف کرتے رہے ہیں۔ اُس کے زیور اور گہنوں کی فہرست گنواتے اور اُس کے ریشمی ملبوسات کا ذکر کرتے رہے ہیں۔ صرف جام دُرّک ہی ایک بلوچی کا وہ واحد شاعر ہے جس نے ہجر وفراق اور وصل و دید سے عاشق کے دل و دماغ پر طاری ہونے والی سرمدی کیفیت کو الفاظ کا جامہ پہنایا اور اِس شاعرانہ چابکدستی، خوبصورت اندازِ بیان اور سلاست و روانی سے پیش کیا ہے کہ سامعین داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مثلاً اپنی ایک مشہور نظم میں محبوبہ کی یاد میں عاشق کے دل کی بیقراری اور جذبات کی برانگیختگی کا ذکر جام دُرّک ان الفاظ میں کرتا ہے۔

کہتا ہے: ؎

من گنوکاں کہ گوں دِل ءَ جیڑاں
دِل گنوکنت کہ گوں من ءَ جیڑیت
گِرّ کنت تنگوئیں دروشمیں بچی
زور کنت شاہ و ظالمیں ترکی:
من مُجاں زنزیرء قبیر۔ لوٹیت۔
لوٹیت ہمایا کہ من صداں تچے
پہ بہا جیڈی ءَ ہمسراں تچے۔

یعنی

میں پاگل ہوں کہ دل سے جھگڑتا ہوں
دل بھی تو پاگل ہے جو مجھ سے جھگڑتا ہے
ننھے بیٹے کی طرح ضد کرتا ہے
اور ظالم ترک بادشاہ کی طرح
مجھ پر ظلم کرتا ہے۔
بہت دور کی
اُس زنجیر گیسوؤں والی کو چاہتا ہے
جو سو میں ایک ہے
اور جو قیمت میں
اپنی ہم عمر سہیلیوں سے لاکھ بہتر ہے۔

ہجر کی گھڑیاں بڑی تلخ اور کربناک ہوتی ہیں۔ جام درک نہ صرف اس تلخی کو محسوس کرتا ہے بلکہ اُس سے ایک عام طرح سامع کے کام و دہن کو بھی آشنا کرتا ہے۔ کہتا ہے :-

ہجر مُنءَ مُوہیناں جھنت پاسان
چو کھیرانی بارتیں آسان
ہیتراراں مَن نیم شپی پاسان
پہ وتی دوست ءَ حُبّ و اخلاصان۔

یعنی

ہجر کی گھڑیاں مجھے چرکے لگاتی ہیں
اور کھیر[1] کی آگ کے شعلوں کی طرح جلاتی ہیں۔

---

[1] جنگلی درخت جس کی آگ بہت تیز ہوتی ہے۔

آدھی آدھی راتوں کو
میں بیدار ہو کر اُٹھتا ہوں
اور، اپنی محبوبہ کی
پُرخلوص محبت کی یاد میں تڑپتا ہوں۔

ایک اور نظم میں، جام درک اس کیفیت کو، اپنے مخصوص طرزِ بیان میں اور زیادہ موثر اور واضح انداز میں پیش کرتا ہے۔ کہتا ہے :-

ڈیل نلگی تابینتگان
من زنگین پیراہنان
مے نلگسان ہتینتگان
ہکتینتگان، ہکتینتگان
ہکتینتگان، جاداتگان
من کہ گنوک ہان وثرلان
پمتن میارت عالمان
ملا و ہنگین کاگدان
عشق ءِ گنوک درماں نہ بنت
تو ڑیں طبیب درمان کننت
ٹپو ہکینگ ءُ درد لونٹ۔

یعنی

میری قامتِ خوش خرام
زرد پیرہن میں تپ رہی ہے۔
میری آنکھیں

انتظار کرتے کرتے پتھرا گئی ہیں۔
پتھرا کر، خشک ہو گئی ہیں۔
خشک ہو کر بے نور ہو گئی ہیں۔
(اے میرے عزیزو!)
جب میں دیوانہ ہو کر
بہکنے لگ جاؤں
تو مجھ پر دم ڈالنے کے لئے
علماء کو مت لاؤ،
اور نہ ہی مُلّاؤں کو
اُن کی کتابوں کے ساتھ لاؤ۔
عشق کے دیوانے ہوش میں نہیں آتے
چاہے طبیب اُن کا علاج
کتنا ہی کیوں نہ کریں۔
اُن کے درد تو صرف
(معشوق کے) بوس و کنار سے ہی
شفا پاتے ہیں۔

یہاں پر اس امر کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ بلوچی شعراء کے کلام میں اکثر توارد کا گمان ہوتا ہے جیسا کہ، جام درک کے اوپر دیئے ہوئے اشعار میں، عشق کے دیوانے کے باب میں علماء، مُلّا اور اُس کی کتابیں اور طبیب کا بیان سے ہر آتا ہے۔ بعض گویّے ان اشعار کو جام درک کا بتاتے ہیں لیکن بالکل یہی اشعار شے مرید کی نظموں میں بھی موجود آ گئے ہیں۔ اُن کے علاوہ، توکلی مست اور بعض دوسرے شاعروں سے بھی منسوب ہیں بصرف یہ نہیں بلکہ کئی اور

اشعار آئیں گے جو دو یا دو سے زیادہ شعراء کے کلام میں راہ پاگئے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ اشعار گویّوں کی زبانی ہم تک پہنچے ہیں جو سینہ بسینہ یاد چلے آتے ہیں۔ ان شعراء نے جن کی اکثریت نوشت و خواند سے نابلد تھی اپنے اشعار کبھی قلمبند نہیں کرائے۔ صدیوں بعد اگر کسی خواندہ شخص نے یا کشمیر میں بعض انگریز مستشرقین نے، جن کے ہم ممنون ہیں ان کے مجموعے ترتیب دیئے تو انہوں نے بھی اس طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ جیسا کوئی گویا سناتا گیا وہ لکھتے گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک شاعر کی اسی بحر کی نظم کے کچھ اشعار کسی دوسرے شاعر کی نظم میں مل گئے۔ اور یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اب صورت یہ بن گئی ہے کہ کسی مستند حوالہ کے بغیر ہم ان کو پہچان نہیں سکتے اور مستند حوالہ مفقود ہے اس لئے ہم نے اسے بہتر سمجھا کہ سردست ان اشعار کو جیسے ہیں اور جہاں ہیں ویسے اور وہاں رہنے دیا جائے۔

بہرحال، حامد رک جب ہجر و فراق کی صعوبتوں کا ذکر کرتا ہے تو اگرچہ وہ اپنا ذاتی تجربہ بیان کرتا ہے لیکن اس کی مراد ہر وہ عاشق ہوتا ہے جو راہِ طلب میں سرگردان رہتا ہے۔ ملاحظہ ہو کہتا ہے ؎

چھیت جان حامد۔ زبان لعل بیت
گھڑی عاشقان ڈگھو رنگ سال بہت
پچوں نہیارے بی حامد ڈر کان
کہ اج ڈو میکہاں ان سرستگان۔

یعنی

جب، حامد کا تن بدن
آتشِ فراق میں جلنے لگتا ہے

۱۔ مسٹر لانگورتھ ڈیمز وغیرہ۔

تو اُس کی زبان سُوکھ کر کانٹا بن جاتی ہے۔

عاشق کے لئے جدائی کی ایک گھڑی

سال کے برابر ہوتی ہے۔

(تیرے عشق میں، اے محبوبہ!

میں ایسا جلا ہوں کہ)

اب تم مجھے دیکھ کر پہچان نہیں سکو گی

کہ میں وہی جام درک ہوں

(جو تمہارے لئے)

اپنا قبیلہ ڈومبکی، چھوڑ چکا ہوں۔

معشوق کی بیوفائی ایک عام بات ہے۔ شعراء ہمیشہ یہی دنا... چلے آرہے ہیں کہ معشوق بیوفا اور بدعہد ہے لیکن اِس کے باوجود اُس کے وعدوں پر... کیا جاتا ہے۔ اسی کیفیت کو جام درک نے اپنے مخصوص انداز میں یوں بیان کیا...

آروچ کہ تو بستہ ئمن

دست دا تنگ و راستین وچن

کادان مدے اندر بدان

مجنوں ءُ بازٔ زہمی مکن

موجیں دلٔ ءُ سیگر مجن۔

ہجران مدے اُو ماہشان

اُو نازنین، شیرین لسان

مہرکن پہ سلطانین سران۔

یعنی

Scanned with CamScanner

(اے میری محبوبہ !)
اُس دن تو تم نے مجھ سے اتفاق کیا تھا
ہاتھ ملا کر
مجھ کو اپنا سچا قول دیا تھا
پھر آج میری جان پر نیش زنی کیوں کرتی ہو۔
(اے محبوبہ !)
اپنے دیوانے کو
اب، اور زیادہ زخمی نہ کرو۔
اُس من موجی کے دل میں
سیہی کے کانٹے چبھویا نہ کرو۔
اے مہوش !
اے شیریں زبان نازنین !
اپنے شاہانہ سر کے طفیل
مجھے اور زیادہ جدائی کی زحمت نہ دو،
مجھ پر محبت کی نظر ڈالو

مُلّا فاضل رِند، بڑا بسیار گو مگر اَدق شاعر گذرا ہے۔ اُس نے روزمرّہ
...سم ہوتی ہیں۔ بعض نظمیں کہی ہیں لیکن زیادہ تر اُس کی نظمیں عربی اور فارسی کا ملغوبہ ہونے
[ع]لاوہ رمزیہ، دو معنی اور اَدق ہیں۔ اُس کی بعض اچھی منظومات سے اقتباس ہم اِس لئے پیش
[نہ کر] سکے کہ اُن کا اُردو ترجمہ بہت ہی مشکل نظر آیا۔ اِس کے باوجود، اُس کی بعض نظموں سے ہم نے

؎ ایک کانٹے دار جنگلی جانور۔ خار پُشت

موضوعِ بحث کے مطابق جو اشعار منتخب کئے گئے ہیں وہ اِس قابل ہیں کہ اُس کی شاعرانہ ... کو اُجاگر کریں اور قارئین سے دادِ تحسین حاصل کر سکیں۔ ملاحظہ ہو کہ شبِ ہجر کی کیفیت بیان کرتے ہوئے مُلا فاضل کیسی کیسی تشبیہات استعمال کرتا ہے۔ کہتا ہے:

شپ چار پاسنت، گمٔ چار قسم ءُ گوں من تنت
دل منی زانت کہ، گوں دگہ ایچ کَس ءُ نہ تنت
گمٔ منی بارنت، منی اُولاک ءِ سر تنت۔
قسمے چہ گرانباریں گُراباں سنگین تر تنت
قسمے چہ یعقوب ءِ خیالاتاں بدتر تنت
قسمے چہ نوک سچین کرتی سِندان تیز تر تنت
قسمے چہ آسمان ءِ فلک تراشان نیشتر تنت

یعنی

رات کے چار پہر ہوتے ہیں
اور غم بھی چار قسم کے مجھ پر مسلط رہتے ہیں۔
میرا دل جانتا ہے کہ
کسی اور کو ایسے غم نہیں ملے ہیں۔
یہ غم سینے کے بار ہیں
جو مجھ پر لاد دیئے گئے ہیں۔
اِن کی ایک قسم
بہت بڑے بوجھ اُٹھانے والے
ہری جانور سے بھی زیادہ گراں بار ہے۔
ایک قسم

Scanned with CamScanner

حضرتِ یعقوب کے خیالوں سے بھی زیادہ
اندوہناک ہے۔
ایک قسم
نئی سان چڑھی،
زرہ بکتروں کو کاٹنے والی تلوار سے بھی
زیادہ تیز ہے۔
اور ایک قسم
آسمان میں دمکنے والے
ستاروں سے بھی زیادہ جنبش مارتی ہے۔

مُلّا فاضل رِند کے اشعار میں فخریہ اندازِ بیاں کچھ زیادہ ملتا ہے بمثال کے
طور پر ایک نظم میں اپنی محبوبہ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے: ؎

جی منی ڈیل ءِ ہمدلیں وَت سیاد
تو پہ من صید و من پہ تو صیاد
تو پہ من شیرین، من پہ تو فرہاد
خاص منان میرین چاکر ءِ اَولاد
نازمنی بالاد ءِ کمن شمشاد

یعنی
اے میری ہمدل اور عزیز!
تُو میرا شکار
اور میں تیرا شکاری ہوں۔
تو میری شیرین

اور میں تیرا فرہاد ہوں۔

میں (چونکہ) میر چاکر رند کی

صحیح النسب اولاد ہوں

اس لئے

اے میری شمشاد قد محبوبہ!

میری محبت کو نہ ٹھکرا۔

میروانی قبیلے کے ایک ہی سردار خیل میں دینار نام کے تین
دینار سجار، دینار عبداللہ خان اور دینار عبدالکریم گذرے ہیں۔ تینوں بڑے نامی گرامی
رہے ہیں، ان کے اشعار کو گویوں نے اس طرح ملا دیا ہے کہ اب ان میں تمیز کر
کوئی مسودہ ہاتھ نہ لگنے مشکل ہے۔ ہم نے بصد دقت ان کے کچھ ایسے اشعار حاصل
جن میں ان کی ولدیت ملتی ہے اس مقالہ میں صرف ان سے ہی استفادہ کیا
دینار عبداللہ خان میروانی نے اپنی محبوبہ سے جدائی میں جو نظم کہی ہے اُس
جگہ کہتا ہے:

دل منی جوش کنت پہ شپی پاسان
زُرتنگ مہر تنگ ءِ عشق ءِ وس و اسان
پہ وتی دوست ءِ لاڈیں گل کھنۂ
باز زہیریں پہ شکر کھند ءَ۔

یعنی

رات بھر
میرا دل جوش کھاتا رہتا ہے۔
اُس مہوش کی فکر

اور اُس کے عشق کے وسوسوں نے

مجھے گھیر لیا ہے۔

میں اُس شکرخند محبوبہ کی

پرخلوص مسکراہٹوں کے لئے

تڑپ رہا ہوں۔

دینارِ عبدالکریم اپنی محبوبہ سے جُدائی کا ایک لمحہ بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ کہتا ہے :-

دوست مِن ءَ مہر رنگ پہ دل وجان اِنت

یک دمے دُور بیت، دِل پریشان اِنت

یعنی

وہ مہوش

مجھے دِل وجان سے عزیز ہے

تھوڑی دیر کے لئے بھی

اگر وہ میری نظروں سے دُور ہوتی ہے

تو مَیں پریشان ہوجاتا ہوں۔

محبوبہ سے دُوری اور برسات کا موسم شاعر کو تڑپا دینے کیلئے ازلی ...جنت کا حکم رکھتا ہے۔ دینارِ عبدالکریم نے اپنی ایک خوبصورت اور سلیس نظم میں اس کیفیت ...و دل نشین انداز میں بیان کیا ہے۔ کہتا ہے :-

مر وچی نود چہ دریا ءَ

رُدان تنت حکمِ اللہ ءَ

شلان تنت ہر سجّر گاہ ءَ

عجب شنزنت مرا گاہ ءَ
اُمل ءِ گوات گرد جاہ ءَ
پری ءِ ہنڈ و جاگاہ ءَ
مناں چو مست و گمراہ ءَ
پہ معشوق و دلواہ ءَ ۔

یعنی

آج بحکمِ خدا
بادل، دریا سے اُٹھ کر
وادیوں کی طرف بڑھ رہے ہیں۔
وہاں پہ ہر صبح کو
میری پری رُو محبوبہ کی ماڑی[1]
ہوادار مکان
اور قیام گاہ پر
خُوب کُھل کر برستے ہیں۔
مَیں بھٹکا ہوا مسافر
اپنی اُس دلنواز محبُوبہ کے لئے
دیوانہ ہُوا جاتا ہوں۔

ایک اور نظم میں دینار عبدالکریم اپنی محبُوبہ کے خیالات کی ترجمانی
بقول دینار، اُس کی محبُوبہ کہتی ہے :-

---

[1] دو منزلہ مکان

روچ بے دراجنت منی خیال ءَ
شب من ءَ گران تنت اچ مہ و سال ءَ
چمّاں گوں راہاں تنت جنین یال ءَ
دَم بہ دَم جارین من وکاب بال ءَ

یعنی

میرے خیال میں
دن بہت لمبے ہو چکے ہیں۔
اور راتیں تو
مجھ پر ماہ و سال سے بھی زیادہ
گراں گذرتی ہیں۔
میری آنکھیں راستے پر لگی ہوتی ہیں
اور میں بیٹھی فال نکالتی رہتی ہوں۔
اپنے محبوب کے
عقاب کی طرح جھپٹنے والے گھوڑے کو دیکھنے کی امید میں
دم بدم راستے کی طرف دیکھتی رہتی ہوں۔

محبوبہ کی بات آئی تو کیا کی محبوبہ سدّو کا گلہ بھی سنتے۔ کیا، باہو کا رہنے والا ایک جدگال نوجوان تھا جبکہ، سدّو لس بیلہ کی رہنے والی تھی۔ کیا ہمیشہ اپنی شلنگ نامی اُونٹنی پر باہو سے لسبیلہ آکر سدّو سے ملتا تھا۔ ایک دفعہ اُس نے کچھ دیر کی تو سدّو نے پیغام بھیج کر اُسے بیوفائی کا گلہ دیا۔ کہتی ہے:۔

کیاؔ تو ۓ! کی دوست، تو ۓ!
کیاؔ ئی بدلوز ہم تو ۓ!

سیاہ چم سلام کنت بندگی
افسوس کہ تو چو گنڈ ئے گئے
سالے شتہ، پیدا ک نہیئے -

یعنی

کیا تم ہو
پیارے کیا ابھی تم ہو
اور بیوفا کیا ابھی تم ہو -

اے بیوفا !
تیری سیاہ چشم محبوبہ تم کو
سلام اور بندگی کہتی ہے -
افسوس کہ تم ایسے مورکھ نکلے کہ
پورا ایک سال بیت گیا
اور تم نہیں آتے -

زہیروک بلوچی کی ایک ایسی صنفِ سخن ہے جسے ہم اُردو کے گیت سے
مشابہت دے سکتے ہیں۔ بلوچی میں ہجر و فراق یا برہا کے اظہار کے لئے اس سے بہتر اور کوئی
انداز بیان نہیں۔ محبوبہ اپنے محبوب کی جدائی میں، ماں اپنے بیٹے کو یاد کرکے اور بہن اور بیٹی
اپنے بھائی اور باپ کی دوری سے مغموم ہو کر زہیروک گاتی ہیں اور بسا اوقات بیساختہ ایسے دلکش
و دل نشین اشعار کہتی ہیں کہ سن کر دل میں ایک ہوک سی اٹھتی ہے اور آنکھوں سے آنسو چھلک
پڑتے ہیں۔

زہیروک کسی ایک شخص کے کہے ہوئے نہیں ہوتے۔ یہ عوام کے فی البدیہہ اور ایسے
بول ہوتے ہیں جن پر موزوں اشعار کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہ صحیح معنوں میں زنانہ گیت یا عو

کیے ہوئے ایسے اشعار ہوتے ہیں جو ملک کے طول و عرض میں پھیلتے اور پرورش پاتے رہتے ہیں البتہ علاقے کی زبان کی مناسبت سے الفاظ کی بندش اور طرزِ ادا میں معمولی سا فرق پیدا ضرور ہوتا ہے لیکن نفسِ مضمون میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوتی۔ زہیروک ہمہ گیر ہوتے ہیں یعنی ان میں مختلف قلبی وارداتوں کا تذکرہ کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً ایک محبوبہ اپنے دل کی بیقراری کا ایک خاص انداز سے ذکر چھیڑتی اور کہتی ہے:۔

دل خیالے پہ گونگے کاریت
دلِ من ءَ بارت وڈیہ پہ ترینیت
دل من وہ پشی ترا نگاں گیجیت
گوندم ءَ جنت چو سنہ ین زبان ءَ
گڑ بندیت چو گوازگی طفل ءَ
چو ڈاچی ءَ دھنزیت پہ وتی ہتر ءَ
جوشش کاریت چو رودیں لوٹی ءَ۔

یعنی

میرے دل میں
عجیب خیال آتے ہیں
ڈرتی ہوں کہ یہ دل
مجھے بہت دُور جا پھینکے گا۔
دل، گذری ہوئی باتیں
مجھے یاد دلاتا ہے
تھان پہ بندھے ہوئے گھوڑے کی طرح
ٹاپیں مارتا رہتا ہے۔

طفلِ گہوارہ کیطرح ضد کرتا ہے۔
جس طرح ڈاچی اپنے بچے کے لئے بلبلاتی ہے
اسی طرح میرا دِل
اپنے دوست کیلئے تڑپتا رہتا ہے۔
(اور آگ پر چڑھائے ہوئے) کانسی کے دیگ کی طرح جوش کھاتا ہے۔

ایک اور زہیروک میں محبوبہ اپنے غمزدہ دِل کے لئے جو تشبیہات استعمال کرتی ہے اُن کی سادگی اور دِلکشی ملاحظہ ہو، کہتی ہے ؎

دِل بہارے کہ رستہ مِن تل ؏
جنگ لوارۂ وگرکی ہوشینگ۔
دِل ڈگھارے کہ سورگی بستہ
نے آپ واریت، نے ڈھال رو دینیت۔

یعنی

میرا دل
دامنِ کوہ پر اُگے ہوئے اُس سبزے کی مانند ہے
جسے لُو لگ چکی ہے
اور، اُس کی جڑیں خشک ہوگئی ہیں۔

میرا دل
اُس زمین کیطرح ہے
جس پر کلر آگیا ہے
اب، اُس میں نہ تو پانی ٹھہرتا ہے
اور نہ اُس پر گھاس اُگتی ہے۔

Scanned with CamScanner

ایک اور حسینہ فراقِ یار میں اپنے دِل پر، یادوں کی یورش کا ذکر اپنے زہیروک میں اس طرح کرتی ہے :-

زہیر منی بشامی درنہدیں ہور نت
کہ دائم ءَ گریوان نت منی چماں۔
روچ من ءَ نہیلنت پہ شپی واب ءَ۔
شپ منی سال نت، روچ منی ششماہ
شپ منی سالیں نہ بنت بامگاہ
روچ منی تیرماہی تپ نت تُندیں۔

یعنی

دوست کے فراق میں میری یادیں
ساون کی جھڑیوں کی مانند ہیں
جو ہر وقت
میری آنکھوں کو رُلاتی رہتی ہیں۔
اور کبھی بھی مجھے
رات کو آرام کرنے نہیں دیتیں۔
میری راتیں سال کے برابر
اور میرے دن چھ مہینے کے ہیں۔
میری اِن سال برابر راتوں کے لئے سحر کوئی نہیں۔
میرے دن
گرمیوں میں چڑھتے ہوئے تیز بخار کی طرح
مجھ پر گذرتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

یہاں سے لد کر کہیں اور چلی جائیگی

اور میرے محتاج دل میں آگ لگا دے گی۔

عاشق ہمیشہ اپنی محبوبہ کی نقل مکانی کرنے سے بے خبر نہیں رہ[...] کبھی اُسے اطلاع بھی مل جاتی ہے کہ اُس کی محبوبہ وہاں سے کوچ کر کے کسی اور دُور کی [...] جانے والی ہے لیکن، تب بھی وہ کچھ نہیں کر سکتا، سوائے اس کے کہ ہاتھ اُٹھا کر خدا سے [...] مانگے کہ کوئی ایسی صورت پیدا ہو کہ اُس کی محبوبہ وہاں سے لد کر نہ جائے۔ پیر بخش [...] ایسا واقعہ پیش آتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے :-

جی منی اللہ و قُدرت پیران

نود و گوانشانی منت ء زیران :

کہ نود بگوارنت و گوانش بکشانت

گوات بلوار بات و سر کنات گورییچ

شالہ، اُومنی دوست ! تو ملڈ اتئے !-

یعنی

اے میرے اللہ !

اور اے میرے قُدرت رکھنے والے پیر !

مَیں بادلوں اور موسمی ہواؤں کی

منت اُٹھاؤں گا

کہ موسمی ہوائیں چلیں

اور بادل خوب برسیں۔

باد و باران کے جھکڑ آئیں

اور گورشیچ، لُو بن جائے۔

ملہ شمال کی ہوا، جو اگرچہ سردیوں میں بہت سرد ہوتی ہے لیکن زمستان ... جب تیز چلتی ہے تو زیریں بلوچستان اور سندھ [...] لُو بن جاتی ہے۔ ۱۰م

خدا کرے کہ ایسا ہو

تاکہ ، اے میرے دوست !

تم یہاں سے لڈ کر نہ جاسکو ۔

شاعر جب موج میں آتا ہے تو اپنے دل کی بات زبان پر لانے میں پس و پیش نہیں کرتا اور اگر وہ واقعی کسی حسینہ کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہوا ہو تب تو اس کی زبان کی کاٹ بے مثال ہوتی ہے ۔ مثال کے طور پر راوت خان جلبانی اپنی محبوبہ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے :۔

منا ں مجنا تئی ، مہر نگیں لیلا !

نصیب ۔ تاں قیامت ءَ رندءَ تئی نہ ہیلاں

اُنل تئی گندگ ءَ بختیتوں سروساہ ۔

نہ بیت نیکی کدی گوں عاشقاں گار ۔

من آ مروارداں سوباں دو بیں لک

عزت ءِ ناں گالاں کہ دیر بستوں دل ءَ سک ۔

یعنی

اے مہوش !

تو لیلےٰ ہے اور میں تیرا مجنوں ہوں

انشاءاللہ

قیامت تک تیرا پیچھا نہیں چھوڑوں گا ۔

اے اُنل !

تم کو دیکھ کر میں ہوش میں آتا ہوں

(میرے ساتھ نیکی کرو)

مرزا کے قابل فخر قلم کی طرح تیز ہو

گور نارمی سے راتوں رات گذر جاؤ

کیونکہ وہاں پہ

بہت سے دھوکہ باز اور چغلخور رہتے ہیں۔

باد صبا سے محبوبہ کی زلفوں کی خوشبو کو پالینے کا اکثر بلوچی شعرائے ذکر کیا ہے لیکن اس کیفیت کو حسین اور دلپذیر پیرائے میں بیان کرنا، جام درک کے بعد بہت کم شاعروں کو نصیب ہوا ہے البتہ بہرام جکرانی نے ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ اس نے اس کیفیت کو جس انداز سے بیان کیا ہے اس سے ایسا لگتا ہے کہ اس وقت بہرام جکرانی کے جسم میں جام درک کی روح حلول کر گئی ہے۔ کہتا ہے :۔

ہوتے بوے کہ بومشی دوست ءِ
دردپ ہو مسکیں وست نشانیان
گون تنت گون سر گواتان جڑانیان۔
من دی مس تئی میں دل ءِ واران
اے زہیرانی اند وہاں ماران۔
من تئی دردان من دل ءِ داران
پہ دپ ءِ چکپے نہ بچاران۔
دیر مبی گوڑی ءَ دومیں روچان
ما پہ تئی چسم ءِ گندگ ءِ لہبان
نہ دئے مہران، نہ دل ءِ رنجان۔

یعنی

ہائے! ہائے! کہ میری محبوبہ کی خوشبو

اُس دُور دیس کی دست نشانیاں
بادلوں کو لانے والی سمندری ہوائیں
ساتھ لا رہی ہیں۔
مَیں بھی اُن کو
اپنے پیاسے دل میں تحلیل کروں گا۔
اور اپنے فراق کے غم و اندوہ بھلا دوں گا
(اے میری محبوبہ!)
مَیں نے زخم دیتے ہوئے دردوں کو
اپنے دل میں سنبھال کر رکھا ہے،
زبان پر کبھی حرفِ شکایت نہیں لاتا۔
(اے محبوبہ!)
اس دو دنوں کی جھوٹی دنیا میں
مجھ سے دُور نہ رہو۔
میں صرف تم ہی کو دیکھ دیکھ کر
خوش ہوتا ہوں۔
اگرچہ تم اپنی محبت سے مجھے نہیں نوازتیں
تب بھی مَیں رنجیدہ خاطر نہیں ہوتا۔

بلوچستان کے خوانین میں سے اکثر نے شعر و شاعری سے شغل رکھا ہے اور بلوچی میں بعض ایسی عمدہ نظمیں کہی ہیں جو قبولِ عام کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔ خان عبداللہ خان احمد زئی اور اُن کے بیٹے میر محبت خان اور میر نصیر خان نوری بلوچی کے بڑے اچھے شاعر گذرے ہیں، مگر افسوس کہ اُن کا کلام قلات کی میری[۱] کے بار بار لٹنے سے تلف ہو چکا ہے، صرف انگلستان کی

---

[۱] خوانینِ قلات کا رہائشی محل

انڈین لائبریری میں اُن کی کچھ منظومات مسودوں کی صورت میں ملتی ہیں اور جرمن مستشرق مسٹر جوزف الفن بین کے ذریعے ہمیں معلوم ہوا ہے لیکن اس وقت سے باہر ہیں۔

کہتے ہیں کہ بلوچستان کے خان میر محبت خان اپنے ایام نوجوانی میں ڈیرہ غازیخان گئے تھے ایک موچی کی بیوی پر عاشق ہو گئے اور اسے اُٹھا کر قلات اُن کے والد میر عبداللہ خان کو جب معلوم ہوا تو اُنہوں نے محبت خان کی کی بیوی کو واپس ڈیرہ غازیخان بھجوا دیا۔ میر محبت خان نے اپنی اس محبوبہ نظمیں کہی ہیں میر محبت خان کی شاعری پر جام درک کا رنگ غالب نظر آتا ہے ہمعصر تھا۔ میر محبت خان اپنی ایک نظم میں کہتا ہے ؎

آمرد کہ پہ عشق ءَ تچنت
یک لنکے تے طعام ءَ چشنت
نئے پہ دپ چیئے گوشنت
نئے اچ دل ءَ آہے کشنت
نئے مُردگ و نئے زندگنت
حق ءَ حضور اُوشتا تگنت
آخر وَتی بہر ءَ گرنت۔

یعنی

وہ لوگ

جو عشق کی راہ پر چل پڑتے ہیں
وہ ایک نوالہ خوراک کا بمشکل چکھتے ہیں
وہ، نہ تو منہ سے کچھ بولتے ہیں

اور نہ ہی دل سے آہِ سرد نکالتے ہیں۔

وہ، نہ تو زندوں میں شمار ہوتے ہیں

اور نہ ہی اُن کو مُردہ کہا جا سکتا ہے۔

وہ حق کے حضور کھڑے رہتے ہیں

اور آخر کار

اپنا حصہ حاصل کر لیتے ہیں۔

ہجر کی کیفیتیں ہر شخص پر مختلف ہوتی ہیں۔ کوئی روتا اور گریہ وزاری کرتا ہے اور کوئی خاموش چُپ سادھے پڑا رہتا ہے۔ کوئی وادیوں اور جنگلوں کی خاک چھانتا پھرتا ہے اور کوئی سگِ لیلیٰ کی طرح در یار پر پڑا رہتا ہے غرضیکہ جیسا ظرف ہوتا ہے ویسا اُس میں [illegible] غم پڑتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ع

غم اس کو دیا، جس کے وہ قابل نظر آیا۔

مُلّا داد رحمان طبری کو اپنی محبوبہ سے گلہ ہے کہ اُسے غم زیادہ کیوں دیتے ہیں۔

کہتا ہے: ؎

دِلبرتئی بازیں غمان

گمانت چو ماری ءَ ڈُھاں

گیشّ نت زہیر دم پہ دُمان

بُرتہش منی امن و اماں

نالان چو بُلبل نیم شپان

یعنی

اے دِلبر!

تیرے غم بہت زیادہ ہیں

جو سانپوں کی طرح

میرے دل میں در آتے ہیں۔

تیری یادوں کی ٹیسیں

دم بہ دم بڑھتی رہتی ہیں

میرا امن و چین غارت کر گئی ہیں

میں آدھی راتوں کو اٹھ کر

تیرے غم میں

بلبل کی طرح نالہ و فریاد کیا کرتا ہوں۔

ملاّ داد رحمان اپنی ایک دوسری نظم میں خوشامد کی زبان اختیار کرتا ہے اور بڑی خوبصورتی سے اپنی محبوبہ کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہتا ہے :-

جانی ! منی جان و جگر !

باگھانی وشش تو ہیں ثمر !

لیلا نیا دین لب شکر !

اچ من مبے تو بے خبر۔

یعنی

اے میری جانی !

اے میری جان اور میرا جگر !

اے باغوں کا خوشبودار پھل ،

اے لیلا صفت لب شکر !

مجھے بھول نہ جانا۔

لکھے پڑھے ذہین لوگ اور وہ شعراء جو علم العروض سے واقف ہوتے ہیں

Scanned with CamScanner

بسا اوقات بڑے اچھے شعر کہتے ہیں لیکن جو خلوص و وارفتگی اور روانی "بے علم" قدرتی شاعروں کے کلام میں پائی جاتی ہے اُن کے کلام میں مشکل سے ملتی ہے۔ اب دیکھئے خدا بخش ہیرو دادانی مری جس نے شاید ہی کسی کتاب کی صورت دیکھی ہو، کس وارفتگی اور خلوص سے اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ الفاظ جیسے سانچے میں ڈھل ڈھل کر اُس کی زبان سے نکلتے ہیں۔ ملاحظہ ہو کہتا ہے: ؎

جھنی تی لوڈو جی تی تو شبیں کھنڈ گان
گام کنے کھپتی، در ہنزرے من آہی ہیر گران
لڑی جن ءِ نہتیا بیت بتی، بیا گو ءِ در کپان
گندان تی لوڈاں، گوراں تی جیڑی تمبران۔

یعنی

بچی تیرے خرامِ ناز کو
اور بچی تیری میٹھی ہنسی کو۔

اے دوست!

تم کہاں، کبوتر کی طرح اِٹھلاتی
اور اونچی گھاٹیوں میں اپنی خوشبو بکھیرتی پھرتی ہو۔

میری رُوح

یہاں پر مجھے چین سے بیٹھنے نہیں دیتی۔

کہتی ہے!

چلو، پہاڑوں کی طرف نکل چلیں

شاید وہاں (پہاڑوں) پر

اے محبوبہ! تم کو

اپنی ہم عمر سہیلیوں کے ساتھ

محوِ خرام دیکھ سکیں۔

توکلی مست، اپنی محبوبہ سمّو کو بکریاں چرانے والے گندریوں کے ہاں دیکھنا پسند نہیں کرتا کیونکہ، وہ جانتا ہے کہ بکریاں چرانے والے گندریوں میں عشق و عاشقی کا سلیقہ نہیں ہوتا۔ بلوچستان میں عشق و محبت کی اکثر داستانیں جتنیوں سے وابستہ رہی ہیں گوہر، شاری، اسٹلی اور رتی وغیرہ حسینائیں جتنیاں تھیں جن کے لئے رند نوجوانوں نے ایک دوسرے کا خون بہایا تھا۔ میر چاکر اور میر گواہرام، گوہر جتنی کے لئے اُس وقت تک رند و لاشار کے گلے کٹواتے رہے جب تک کہ وطن کی اینٹ سے اینٹ نہ بجادی اور غیر قوموں نے اُن کے علاقوں پر قبضہ کرکے اُن کو سندھ اور پنجاب کی طرف دھکیل نہ دیا۔ بہر حال توکلی مست بھی یہی آرزو دل میں رکھتا تھا کہ کاش اس کی محبوبہ سمّو گندریا ہونے کی بجائے کوئی حسین جتنی ہوتی تاکہ اس کا بھی شمار رند و لاشار کے عاشق مزاج لوگوں میں ہوتا۔ اسی لئے کہتا ہے :-

جوان نہ انت سمّو، گوں بزگلی مردان
بزگلیں مردان و دریتہ شلواران۔
جوان تست سمّو من گز دریں کھچے
بگیہ ء ترا پولی گستیں ہیران
وھشتریں نزر دوان سُہاگیں نان۔

یعنی

سمّو، بکریاں چرانے والوں کے ساتھ
جن کی شلواریں پھٹی پُرانی ہوتی ہیں۔
سمّو، تو گز (الچی) کے درختوں والے
ایک سرسبز کچھ میں اچھی لگتی،
جہاں شام کے وقت

دودھیل اونٹنیاں جب بلبلاتی ہوئی آتیں
تو ڈیرے میں اُن کے بچے
کلبلیں کرتے اور شور مچاتے رہتے۔

بھرام جکھرانی ایک خوش بیان شاعر گذرا ہے لیکن محبوبہ سے جُدائی کا جو مضمون اُس نے باندھا ہے اور جو پہلے گذر چکا ہے توکلی مست نے اُس میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ گو مختصر الفاظ میں مگر بھرپور طور پر اس چابکدستی اور خوبصورتی سے پیش کیا ہے کہ اس سے بہتر کہنا ممکن نہیں معلوم ہوتا۔ ملاحظہ ہو توکلی مست کہتا ہے :-

جی تئی بوان ، اَچ منی جان ءَ دیر مبے
زرد ءَ دیر گیجے : دید گانی مہر ءَ مزیمہ

یعنی

جی ، تیری خوشبو کو
اے میری محبوبہ ! مجھ سے
تم دُور مت ہو جاؤ۔
اگر تم اپنا دِل مجھ سے دُور رکھنا چاہتی ہو
تو بیشک رکھو
مگر ، میری آنکھوں کو
اپنی پیاری صورت (کے دیکھنے) سے محروم نہ کرو۔

توکلی مست ، سندھ میں گھومنے پھرنے کے بعد جب واپس وطن کا رُخ کرتا ہے تو اُسے کونجوں کی ایک قطار اُڑتی ہوئی نظر آتی ہے جن کی آواز اُسے بڑی پیاری لگتی ہے لیکن سمو کی ہنسی کی آواز سے اُن کی کیا نسبت ! اس لئے کہتا ہے :-

کونج شہ سندھ ءَ بیاتنت ولد آہیں موسم ءَ

من گونا آ کونج ءِ وتی ءَ سنگت جنیگاں
کونج پہ بال ءَ وتی بہا باد گراں رواں
کونج گوں امانت ، منی دل ءِ درمان نہ بنت
منی دل ءِ درمان ہمل ءِ وشیں گند گنت -

یعنی
کونجیں موسم بدل کر کے واپس ہوئی ہیں
تو میں بھی
کونجوں کے ایک جھنڈ کے ساتھ چل پڑا -
کونجیں اُڑتی رہیں
اور میں پیدل چلتا رہا -
کونجیں آواز لگاتی جا رہی ہیں -
لیکن اُن کی آواز
میرے دل کا درمان نہیں بنتی
میرے دل کا درمان تو صرف
ہمل کی ہنسی کی میٹھی آواز ہی ہے -

ہجر و فراق کی گوناگوں کیفیتوں کا بیان ہر بلوچی شاعر نے مبالغہ
کیا ہے - ہر شاعر کا رنگ اپنا ہوتا ہے - نوشکے کے مشہور شاعر فقیر شیر جان کا اپنا پیرایہ
وہ عوام کی سلیس زبان اور سادہ انداز بیان میں بڑے پتے کی بات کہہ دیتا ہے - وہ عشق کی آگ
میں جل رہا ہے لیکن زبان پر شعر کے بول جاری نہیں ہوتے " تملا کر چیخ اٹھتا ہے کہ :ے

دل منی بشامی جڑ ءِ بندیت
چو نہ گوریت ئیں گہگر ءِ گرندیت
یا خدا ! بوجے منی دل ءِ کلفان !

کوہسری منّورے شرشم ءِ رُستہ
گوارُشکھ ءِ پُھلتے، گُلات گرءِ نشتہ۔
داتگی اقرائے بے نوک ءَ
آپچشے لگّیت منے دل ءِ توک ءَ۔
کدّمے پُرکن آپی نوکاپ ءَ
تو برپچی منے دِل ءِ لاپ ءَ
دِل نزا ' سرد بیت اَتش تنی بو ءَ
شہ مشک ءِ عنبیرءِ . بوتنی زیبات انت

یعنی

میرے دل پر
ساون کے بادلوں کی طرح غم چھائے ہوئے ہیں
اور نہ برسنے والی گھٹاؤں کی طرح
گرجتے ہیں۔
یا خُدا! میرے دل کے قفل کھول دے۔
تو نے منّورے کی ایک ایسی بوٹی دیکھی ہے
جو پہاڑوں کی گھاٹیوں میں اُگتی ہے،
یا، وہ ایک ایسا گُلِ لالہ ہے
جو گھر میں ساماں کی زینت ہے۔

اسرے

ایک خوبصورت اور خوشبودار صحرائی بوٹی - الخ ۔

چاند رات کو مجھ سے ملنے کا وعدہ کیا ہے۔
میرے دل میں (انتظار کی) آگ لگی ہوئی ہے
اے میری محبوبہ!
بارش کے تازہ پانی سے ایک کٹورا بھر کر
میری جان و تن پر ڈال دے
شاید اُس کی جانفزا خوشبو سے
جو تیری خوشبو جیسی ہے
میرا دل ٹھنڈا ہو جائے۔
اے محبوبہ!
تیری خوشبو تو
مشک و عنبر کی خوشبو سے بھی بہتر ہے۔

(۳)

خواہشِ وصل کے بیان میں

جیسا کہ ہونا چاہیے ہر عاشق اپنی معشوقہ سے وصل کا تقاضا کرتا رہتا ہے۔ اُردو اور فارسی شاعری میں ہزاروں بلکہ لاکھوں اشعار صرف اسی ایک موضوع پر ملیں گے۔ یہی حال بلوچی شاعری کا بھی ہے البتہ اُن کے معاشرہ میں جو بُعد ہے وہ شاعری میں بھی صاف جھلکتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک بلوچ شاعر وہ بات نہیں کہہ سکتا جو ہند و ایران کے ترقی یافتہ معاشرہ میں رہنے بسنے والا ایک شاعر کہہ سکتا ہے۔ اس لئے بلوچی شاعری پر تنقید و تبصرہ کرتے وقت ہم وہ پیمانہ اور کسوٹی استعمال نہیں کریں گے جو اُردو اور فارسی کی درس گاہوں کے باکمال اساتذہ استعمال کرتے ہیں۔

بلوچی شاعری کو پرکھتے وقت یہ بات ہمارے پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ بلوچ ابتک ایک بادیہ نشین، گلہ بان، زیورِ تعلیم سے نا آراستہ، نو آبادیاتی نظامِ حکومت کا شکار اور تہذیب و تمدن کی جملہ جدید برکتوں سے محروم چلا آتا ہے لیکن وہ سخت جان، سخت کوش، قانع، غیور اور قربانی و سرفروشی کے فطری جذبات سے سرشار ہے۔ اُس کی زبان غیر ترقی یافتہ، سادہ اور سلیس ہے۔ اُنکی شاعری لفّاظی اور ملمع سازی سے پاک ہے۔ اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ بلوچی شاعری کو پرکھنے کے لئے اُس پیمانہ اور کسوٹی سے کام لینا صحیح ہوگا جو زمانۂ جاہلیت کے عرب شعراء کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ تب ٹھیک طور پر یہ اندازہ لگایا جا سکے گا کہ بلوچ شاعر فطرت کی اس نعمت غیر مترقبہ سے کس حد تک مستفید ہوا ہے۔

کپنتی زرنگین جھیگٹ وتی ءَ

یعنی

جب میں

اپنی ہنس جیسی خوبصورت محبوبہ سے رُخصت ہُوا

تو اُس کے آنسو

اُس کے ریشمی پیراہن کے گریبان پہ

گرتے اور منتشر ہوتے رہے۔

اسی مضمون کو بولی وال کے عنوان سے ایک دُوسرے نامعلوم شاعر نے نہایت خوبصورتی سے باندھا ہے۔ جام درک یقیناً ایک بہت بڑا شاعر اور زبان کا مالک تھا لیکن اس مضمون میں وہ بات پیدا نہیں کر سکا ہے جو اس نامعلوم شاعر کے ہاں ملتی ہے۔ کہتا ہے :-

خاوند ! بیار تہ مئے دوستین مردم ءَ
ڈُکھاں بہر کنوں مھتاجیں دل ءَ
آنکہ نشتہ مئے چپّیں پلو ءَ
انزی ریحیتہ جو گوار و کمیں جُمرہ ءَ
ترکنت ترُ دنگی زانانی سر ءَ
مینت برجل ءَ نوک مُہریں گور ءَ۔

یعنی

(میں نے دُعا مانگی :)

اے مالک ! تو میرے دوست کو لے آ

تاکہ ہم دونوں آپس میں مل کر

اپنے آرزومند دلوں کے دُکھ
بانٹ سکیں۔
اتنے میں وہ بائیں طرف سے آکر
میرے پہلو میں بیٹھ گئی۔
اور برسنے والے بادلوں کی طرح
آنسو بہانے لگی۔
آنسو اُس کی نئے اُبھرے ہوئے پستانوں
اور رانوں پر گر گر کر ٹوٹتے رہے۔

جام دُرک اپنی ایک نظم میں اپنی محبوبہ کو ملاقات کی دعوت دیتے ہوئے کہتا ہے :

دُر حدیث بیا کہ دُش حدیث بیتوں
اُندو ہاں ہجر تیگاں بگالاؤں
دشمناں حاک من دیدگاں ساؤں۔

یعنی
اے دُرگفتار محبوبہ !
آ، کہ کچھ اچھی باتیں کریں۔
غم ہجراں کا ذکر کریں
اور رقیبوں کی آنکھوں میں
مٹی پلیس کر ڈال دیں۔

کہتے ہیں کہ پرانے زمانوں کے بلوچ اپنے قول کے بڑے پابند ہوتے تھے۔ اس مضمون میں رندوں کے چار قول بہت مشہور ہیں جو شے مُرید وہانی کی داستانِ عشق

کا باعث بنے۔ اِس بیسویں صدی میں بھی، جبتک بلوچستان پر انگریزوں کی حکمرانی تھی،
بلوچ کے وعدہ و قول پہ انگریز پُورا بھروسہ کیا کرتے تھے۔ دونوں طرف سے قول و زبان کا
یکساں احترام کیا جاتا تھا۔ کڑی سے کڑی آزمائش میں پڑ کر بھی بلوچ نے وعدہ خلافی نہیں
کی ہے۔ بہرحال یہاں پہ بات شاعری کی ہو رہی ہے، تاریخ و روایات کی نہیں ہے۔
ہم ایک شاعر کا قول پیش کرتے ہیں جس نے اپنی محبوبہ سے ایک قول باندھا اور اُسے ایک
نادر پیرائے میں بیان کیا۔ یہ شاعر تھے مُلّا فاضل رند، جس نے اپنی محبوبہ کو وچن دیا کہ :-

سی نہ مانت و بہ سے ءُ بوستان
من وتی جان ءَ پہ نمد پوشان
انگت نہ بجان چہ وعدے دوستان۔

یعنی

اگر میرے تیس[30] (دانت) نہ رہیں
اور میں تین سہاروں (دو ٹانگیں اور عصا) پہ کھڑا رہ سکوں
اور نمد پوش صوفی بن جاؤں
تب بھی اے میری محبوبہ!
تیرے ساتھ کیئے ہُوئے اپنے وعدے سے
مَیں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔

ملک دینار عبدالکریم میروانی کو سخت قبائلی تنازعات کا سامنا ہُوا۔ کئی
سال وہ سراوان اور خاران میں بھٹکتا اور شاعری کرتا رہا۔ اپنی ایک نظم میں خدا سے دُعا مانگتے
ہُوئے کہتا ہے :-

خداوندا! بدے تواں ءَ
بہ بندان دُر مرجان ءَ

Scanned with CamScanner

ترپوکین ماہِ تابان ءَ
چراگھ رنگین ءُ شکرزوان ءَ ۔

یعنی

اے خداوند ! مجھے توانائی بخش
کہ میں اُس دُرِ مرجان کو
اُس ماہِ تابان کو
اُس شمع رُو اور شیریں زبان کو
پھر دیکھ سکوں ۔

شبِ وصل جسے نصیب ہو اُس کی خوشیوں اور سرمستیوں کا کیا کہنا۔ وصل کی کیفیت کو بیان کرنے میں شعراء نے دفتر کے دفتر سیاہ کئے ہیں لیکن بلوچی کے ایک لَدُنی شاعر پیر بخش جنگ بنگزئی نے دو لفظوں میں اس تمام کیفیت کو سمیٹ لیا ہے جو جاننے والے پر اُس وقت گذرتی ہے ۔ پیر بخش نے صرف دو لفظوں کا سہارا لیا ہے اور ایسی بات پیدا کر دی ہے جو ایک پوری نظم میں بھی نہیں سما سکتی ۔ سر کا سلطان ہو کر بہشت بن جانا، ایک ایسی ترکیب ہے جس کی نظیر بلوچی میں اور کہیں نہیں ملتی ۔ دیکھئے پیر بخش کس سلاست و سادگی سے کہتا ہے : ؎

سرمنی سُلطانین بہشت بستہ
منءَ اُلّی ءَ ، مس جائگی باگھ ءَ
دوست منی پھلّے ، لاتقبنت پاگ ءَ ۔

یعنی

(رات) مجھے ایک سلطان جیسی تمکنت
اور بہشت جیسا عیش و نشاط نصیب ہُوا ،

اپنی اُٹل کے حاکمانہ باغ ہیں۔
جس کا وہ ایک ایسا پھول ہے
جو زیبِ دستار ہونے کے لائق ہے۔

عزت للہ پھنگوری ایک دِل جلا، عاشق مزاج اور منفرد...
اُس نے پھرک کے عشق میں کیسی کیسی مصیبتیں جھیلیں اور ہجر و فراق کے کیسے کیسے...
وہ ایک الگ داستان ہے لیکن عشقیہ شاعری میں اُس نے جو مقام پیدا کیا وہ...
اور منفرد ہے۔ اُس کے اشعار سادہ، دلکش اور پُرسوز ہیں۔ اپنی ایک نظم میں...
ملاقات کی تمنّا میں کہتا ہے:

من ءَ کہرباتیرے چو جتگ کاری
کادِ تگ تگیھ دکادی سیاہماری
گلگل ءَ جوناں اچ دپ ءَ کاری
چہ بروتاں وربتگیں ریشان
چہ بروتانی سرشم ءَ کاہنت۔
گیگد : تنی جیک وریشیں منی سیاہین
من شپے بیچا بنت تہارماہین۔

یعنی
اُس برق دلکش محبوبہ نے
مجھے ایک ایسا تیر مارا ہے،
جس نے (میرے دل کو) تلوار کی طرح کاٹا

Scanned with CamScanner

اور کالے ناگ کی طرح ڈستا ہے۔

خون میرے منہ سے اُبل اُبل کر گرتا رہتا ہے۔

میری مونچھوں کے درمیان سے نکل کر

میری گھنی داڑھی کے اُوپر سے بہتا ہے۔

اے میری کیگد[۱] سے معطر محبوبہ!

خدا کرے کہ ایک اندھیری رات کو

میری کالی داڑھی اور تیرے کالے گیسو

(ایک سرہانے پر) آپس میں مل جائیں۔

توکلی مست غالباً اس دُنیائے فانی میں، اپنی محبوبہ سمو سے وصل کی خواہش نہیں رکھتا۔ اُس کی نظروں میں سمو جنت کی ایک حُور ہے اور حوروں سے تو صرف عقبیٰ میں بہشت کے باغوں کے اندر ملاقات ہو سکتی ہے۔ اس خیال سے توکلی مست کہتا ہے: ے

سمو گوں حُوران نشتہ من طُوبائی بُن ءَ

کوثر ءِ آپان نوشں کنت نیر ءِ پیالو ءَ

پیالوے نیر ءِ ایرنت پہ مست ءِ نیت ءَ۔

یعنی

سمو، درخت طُوبیٰ کے نیچے

حُوروں کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہے۔

نُور کے پیالے میں آبِ کوثر پیتی ہے۔

اُس کے پاس نور کا ایک اور پیالہ

مست (توکلی) کے لیے بھی رکھا ہوا ہے۔

۱؎ ایک خوشبودار بوٹی

(۴)

قاصد سے خطاب :۔

دنیا بھر کے شاعروں کا یہ طریقہ رہا ہے کہ تصوراتی قاصدوں کے ذریعے اپنی محبوبہ کا حال دریافت کرتے اور اپنا حال اُسے سُناتے رہے ہیں۔ اِس کام کے لئے زیادہ تر کبوتر کو موزوں سمجھا گیا ہے البتہ ہندی اور بعض دوسری زبانوں میں شعرا نے کوّے کو بھی پیغام رسانی کا کام سپرد کیا ہے غرضیکہ۔ قاصد یا نامہ بر ہمیشہ سے شاعر کے ساتھ لازم و ملزوم رہے ہیں اور وقت بے وقت شاعر کا کوئی پیغام یا کوئی خط لے جا کر اُس کی محبوبہ کو پہنچاتے اور اُس کا جواب لاتے رہے ہیں۔

جہاں تک بلوچ شعراء کا تعلق ہے اُنہوں نے اپنی محبوبہ کو خط کبھی نہیں لکھا۔ ممکن ہے اِس کی وجہ یہ ہو کہ وہ دونوں اِس فن سے نابلد تھے۔ کسی مُلّا کے سامنے بیٹھ کر اپنی محبوبہ کو خط لکھنا اور اپنے رازہائے درون پردہ کو افشا کر دینا وہ مناسب نہیں سمجھتے تھے اِس لئے اُنہوں نے قاصد کو صرف زبانی پیغام دے کر بھیجنے کو موزوں خیال کیا اور اُس سے جی بھر کر کام لیا۔

بلوچی شاعری میں کبوتر، قمری، طوطی، فاختہ اور کونج پرندوں میں اور بادل، نود[١]، نسیم سحر اور موسمی ہوائیں فطرتی عناصر میں شاعروں کے پسندیدہ قاصد اور پیغامبر رہے ہیں البتہ رزمیہ شعرا نے لوڑی یا ڈوم گوئیوں سے اکثر قاصدی کا کام لیا ہے۔ بہر حال شہ مریدؔ کی محبوبہ ہانی بادلوں سے

١؎ بادل عام طور پر بلوچی میں نود کہتے ہیں لیکن اردو ترجمہ میں کہر کہنا اچھا نہیں لگتا اس لئے ہم نے نود کا ترجمہ اکثر بادل کیا ہے۔

مخاطب ہو کر کہتی ہے :-

نودان ! گوں شُما سوالیگان

بجلیت گوارگان ضعیفیان

گوارت مں زرء قبرین ء

اُدو رمگء دربند ء

زمسّان شئے ہمیشہت

شئے ء چوٹوان سیاہیان

نادراح ءَ گننت فراحیان

آگاہ ء گننت وابینان -

سرسایگ سرو پاگی بت -

یعنی

اے بادلو !

میں تم سے درخواست کرتی ہوں

کہ یہاں پر

اپنا نرم نرم برسنا چھوڑ دو -

(اگر تمہیں برسنا ہی ہے)

تو بپھرے ہُوئے سمندر پہ جا کر برسو ،

یا مکہ کی درگاہ پہ جا کر برسو ،

(جہاں شئے مُرید رہتا ہے)

وہاں پر برسو اور شئے مُرید کے سبزہِ خط کو

اور اُس کے لمبے لمبے کالے کالے کاکلوں کی اُن لٹوں کو بھگو دو

Scanned with CamScanner

جو ... سوں کو بیمار
او ... وے ہوئے دلوں کو بیدار کر دیتی ہیں

رہا ... نماز
اور شے مُرید کے سر اور پگڑی پہ سایہ کر دو۔

بلوچوں میں ننگ[1] کا معاملہ بہت خطرناک ہوتا ہے۔ اگر کوئی خاتون کسی علاقے میں بیاہی ہوئی ہو اور ایک دن وہ اپنی چوٹی سے کچھ بال کاٹ کر یا اپنی گریبان کا ایک حصہ پھاڑ کر اپنے کسی محرم[2] کے پاس بھیج دے تو اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اُس خاتون کی توہین کی گئی ہے یا اُس کی عزت و ناموس پہ ہاتھ ڈالا گیا ہے۔ اب یہ اُس خاندان کا فرض ہو جاتا ہے کہ اُس کا انتقام لیں۔ ایسے حالات میں بسا اوقات خاندان کے خاندان کٹ مرے ہیں۔

ماہناز نامی ایک نوجوان عورت میر چاکر کے بیٹے شاہداد سے بیاہی ہوئی تھی۔ شاہداد نے مرگو نامی اُس کی سوکن کی باتوں میں آ کر ماہناز پر الزام لگایا اور اسے طلاق دیدی۔ ماہناز نے اس توہین پر اپنے بھائیوں کو انتقام کے لئے پکارا۔ مگر کس خطرناک طریقے سے! کہ آج کی غیور بلوچ ان الفاظ کی چبھن کو برداشت نہیں کر سکتا۔ ماہناز کہتی ہے:-

من روان راہ و راہ ... ندان
بلکہ وتی تنگ ہ سروُمے گبندان
چہ وتی دستیںکاں جڑے ستدان
چہ وتی گوش ہ کنتلاں ٹمے
چہ وتی پاتین ءَ چدی کالکے

---

[1] ننگ بلوچی میں ہر اُس شئے کو کہتے ہیں جو عزت، حیا، اور ناموس و غیرت سے تعلق رکھتا ہو، جیسے ... اور جورو، سر فہرست ہوتی ہے۔ [2] ... برجی رواج کی ... سے کسی خاتون کا محرم ... ارث

چہ وتی شارین دامن ءَ راڈے
رھگوزی مرد ءِ پلّوءَ بندان
پہ وتی ہمودان کہ بات منی نشتہ
منی سلاہان واحوالی سرکنت
کہ شاہدا منی ننگانی بلا زرنگ

یعنی
میں جا کر کسی راستے اور رہگذر پہ
بیٹھ جاؤں گی۔
شاید
اپنے گاؤں کے کسی شخص کو وہاں سے گذرتا دیکھ لوں
تب میں
اپنی دستینکوں میں سے ایک موتی
اپنے کانوں کی بالیوں میں سے ایک دانہ
اپنی چوٹی کے بالوں کا پچھلا گچھا
اور اپنے ریشمی پیراہن کے دامن سے
ایک ٹکڑا اکھاڑ کر
اس راہ چلتے شخص کے پلّو میں
باندھ دوں گی
تاکہ وہ وہاں جائے

تی منکوں یا موتیوں کی لڑی جو عورتیں کلائی پہ پہنتی ہیں۔ (کم)

جہاں میرا بھائی رہتا ہے

اُسے میرا سلام پہنچائے

اور اُسے

میرا حال سُنا کر کہہ دے

کہ، شاہداد نے میرے ننگ و ناموس کو

برباد کر دیا ہے۔

شے بنگو ایک مشہور شخص گذرا ہے اُس کے عشق و

مشہور ہیں، عورتیں اُس پہ مرمٹتی تھیں، ایک دفعہ جب وہ اپنی محبوبہ سے

اُس کی محبوبہ اُس کی تلاش میں نکلی، ایک مشہور نظم میں ہرنی سے مخاطب

بَرتی زَرْ ہوکیں آسکلو !

تئی گٹ ءَ گوں زرّ ءَ گران

پا دان ءَ بنداں زنگلان

شے بنگو ءَ چیتی کنے۔

یعنی

اے صحرا کی وحشی ہرنی !

میں تیری گردن میں

چاندی کا کڑا ڈال دوں گی

اور تیرے پاؤں میں

اچھے زنگل[1] باندھ دوں گی

اگر تم جا کر شے بنگو کو

---

[1] سیب کے چھوٹے چھوٹے دانے۔ ایج

میری طرف پھر راغب کر دو۔

جامِ دُرک کے پاس ساون کی گھٹائیں اور کڑکتی بجلیاں اُس کی محبوبہ کا پیغام پہنچاتی ہیں۔ کہتا ہے: ے

انگنت کھندان ءِ گروک دوشی
کیہوی جیہ جلگاہی یار ءِ
حال دوستانی د انگنت مارا
ماتُگی گچیناشتیں ہور جان ءِ۔

یعنی

رات کو، سرسبز وادیوں کی طرف سے
بجلیاں، مخموروں کی طرح جھومتی ہوئی آئیں
اور ہمیں
دوستوں کا حال سنا گئیں۔

ہم نے
پھول کی خوشبو کی طرح
انہیں اپنی جان میں تحلیل کر لیا۔

ایک صبح کو جب نسیمِ سحر، خوشبوؤں میں بسی ہوئی معطر و معنبر ہو کر آئے تو، جامِ دُرک اُس سے کہتا ہے: ے

او ملین! بے پُرسر ءِ بہشتی یے
اش لطیف ءِ تو پلوءَ ءِ کایے:
گوں گل ءِ دیم ءِ معتبل گتے دوشی
بیرم ءِ آسی سرگتہ مبتوس

کہ یہ مرض اسے کہاں سے اور کیسے لگا۔ پھر اپنے سوال کا خود جواب دیتے ہوئے کہتا ہے:

ہوَبے مَن ءَ گپتہ دل ءَ !
بیشک ءَ ہمے ہوبے ءِ نشان
صُبح ءَ سمین وَ مبی ءَ
بوئی در ہدان ءَ آرتگنت
اَچ دلرُبائی پلّو ءَ
مان آسنگ و بود آرتگان
بود آرتگ و سار بیتگان
دست بستگ ءَ اُوشتاتگان۔

یعنی
میرے دل کو ایک خطرناک مرض لگا ہے
بلاشبہ اس خطرناک مرض کی نشانیاں (مرا شیم)
نسیمِ سحر اور مرطوب ہوائیں لے آئی ہیں
وہ میری دلرُبا کی طرف سے
خوشبوؤں کی مہک لے آئیں
جب دلرُبا کی مہک مجھے لگی
تو میں گرا اور گر کر سنبھل گیا
سنبھل کر ہوش میں آ گیا۔
اور اُس کے حضور میں
(غائبانہ) ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

ڈوم گویوں کے ذریعے نامہ و پیام کرنا مری :- در حضور ماؤں کا ایک
قدیم دستور رہا ہے۔ جیر لڑائی یا واقعہ کے بعد وہ خود جو رزمیہ اشعار کہتے : ان کے قبائلی (ریزواد)

Scanned with CamScanner

شاعر کہتے، اُن کو گویّے زبانی یاد کرکے فریقِ مخالف کی شبینہ محفلوں میں جاکر گاتے لیکن ایسا بہت کم دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی عاشق نے اپنی محبوبہ کو بھی ڈوم گویے کے ذریعے عشقیہ اشعار بھیجے ہوں۔ غازی خان کے بزدار بلوچ قبیلہ کا ایک مشہور شاعر گذرا ہے اُس نے ڈیرہ غازی خان کے بزدار بلوچ قبیلہ کا ایک مشہور شاعر گذرا ہے اُس خانے نامی ایک شخص ڈیرہ غازی خان کے بزدار بلوچ قبیلہ کا ایک مشہور شاعر گذرا ہے اُس نے ڈوم گویے کو مخاطب ہو کر اپنی محبوبہ کی بِستا یا تعریف میں ایک دِلکش نظم کہی ہے جو پیغام کے پیرائے میں محبوبہ کی بِستا کا ایک حسین امتزاج ہے۔ کہتا ہے :-

بیا اُو وشں گوشیں لوڑی پھِران ءَ
رباب ورِپَگیں ساز ءِ جنان ءَ
برَو اُودان کہ دوست اِنت مجلسانی
لطیفیں مُرگھ و آہو جیہ ہانی
گُل ءِ دُرسان چہ جیرتیں دُرو شمانی
کہیبی تُور وسِتوگی لَڈ گانی
سلامان سر کنئے تَو دل پہ جانی
کہ گُل اِمتے با نکیں، من نو کرانی
دلانی مالکینت من چے گوشانی۔

یعنی

اے خوش الحان ڈوم!
اپنا رباب اور پرپُکٹ کی بنی ہوئی سارنگی بجاتا ہوا،
پھرتے پھراتے
میرے پاس آجا،
(اور پھر میرے اشعار لے کر) وہاں چلا جا

۱؎ ایک درخت کا نام جس کی لکڑی سے سرود وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ الخ

جہاں پر میری محبوبہ

وہ نازک اندام پرندہ،

وہ صحرا کا آہو

مجلس میں بیٹھی ہوئی ہے

وہ حور شمائل سب میں نمایاں ہے

اُس کی رفتار میں عشوقانہ بانکپن

اور چکوری کی سبک خرامی ہے۔

اُس دل سے پیاری محبوبہ کو

میرا سلام پہنچا دے۔

وہ پھول میری بادشاہت ہے

اور میں اُس کا نوکر ہوں۔

وہ میرے دل کی مالکن ہے

اس سے زیادہ اُسے

میں اور کیا کہوں!

سمندری ہواؤں میں نمی کی وجہ سے ایک گونہ خنکی محسوس ہوتی ہے۔ جام دُرنگ کو ان سے اپنی محبوبہ کی مہک آتی ہے لیکن دیناد عبدالکریم میرانی کو اُن میں گرمی اور تپش محسوس ہوتی ہے اس لئے کہتا ہے:۔

جی تہ اکنوش اچ زری نیب

سارت جتے شی کیگہ دیم ء

دا گندے مہر نگین گل اندام ء

زبادگ ء، سوچے شے دل آرام ء۔

یعنی

اے سمندر کی طرف سے آنے والی نرم ہوا !

میری محبوبہ کے چہرے پر سے

بادِ سرد بن کر گذرنا

ورنہ اُس کے چہرے پر داغ پڑ جائیں گے

اور اگر تُم زیادہ تیزی دکھلاؤ گی

تو، میرے دلِ آرام کے چہرے کو

جلا دو گی۔

یہ نہیں معلوم کہ ملتان کے کبوتروں میں وہ کیا خاص خُوبیاں ہوتی ہیں کہ دینار عبدالکریم خصوصیت کے ساتھ ایک مُلتانی کبوتر کو قاصد بنا کر اپنی محبوبہ کے پاس بھیجتا ہے ممکن ہے ملتان کا کبوتر زیادہ خوش آواز اور خوبصورت ہو جیسا کہ شاعر کہتا ہے کہ چونکہ تم خوش آواز ہو اور تمہارے پروں پر خوبصورت قدرتی نقش و نگار ہیں اِس لئے تم ہی میرا پیغام لے جاؤ۔ ملاحظہ ہو، کہتا ہے :-

جی بچوت مُلتانی، خوش آوازیں !

تئی عجب نقشیں بانزولنت سازیں

رہ بمواد کہ دوست ہزار نازیں

نُشتہ من بُرزیں گوات گرءِ سازیں

بندگی عرضاں، سر بکن بازیں ؛

سائُنی ہیرپ و مُحبّت مقارین

چہ بدیں گُر توں، تو بگوش بارین

تئی گلوءَ اتکہ پتن آزادین

وشں نہ بنت مار اشہر بازادین
دردِ دل ءُ لگھیت مسل کا ٹارین ۔

یعنی
جی تجھے ! اے ملتان کا خوش آواز کبوتر !
تیرے پروں اور بازوؤں پر،
قدرت نے عجب نقش و نگار بناتے ہیں
میرا پیغام لیکر وہاں جا
جہاں میری ہزار نازوں والی محبوبہ
اپنی اونچی، ہوادار اور سجی ہوئی
ماڑی میں بیٹھی ہوئی ہے۔
اس کے حضور جاکر
میرے نیازمندانہ سلام عرض کر دے
اور پھر اس سے کہہ دے
کہ تم نے مجھ پر
ساون کی گھٹاؤں، آندھیوں اور جھکڑوں کی طرح
دنیا تاریک کر دی ہے۔
مجھے بتا تو سہی،
کہ میں نے کیا بُرا کیا ہے،
کہ تم نے
ایک ایسا، دل دکھانے والا پیغام
مجھے بھیجا ہے۔

Scanned with CamScanner

اُس دن سے مجھ کو
آبادیاں اچھی نہیں لگتیں۔
اور ہمیشہ درد کی ٹیسیں
کٹار کی طرح میرے دل میں لگتی رہتی ہیں۔

صدو بلیدی قبیلہ کی ایک حسینہ تھی جس پر باہو کا رہنے والا نوجوان کیا عاشق تھا۔ کیا کی سواری میں شلنگ نامی ایک ایسی سانڈنی تھی جو ایک رات میں سو میل کا سفر طے کر سکتی تھی۔ کیا، صدو اور شلنگ کی داستان میں شاعروں نے بڑا حسن اور دلکشی پیدا کی ہے۔ عام طور پر یہ باور کیا جاتا ہے کہ یہ اشعار کیا اور صدو نے خود کہے ہیں:۔

ایک دفعہ صدو ایک طوطا پکڑ کر اُسے کیا کے پاس قاصد بنا کر بھیجنے کو تیار کرتی ہے۔ صدو جس انداز سے طوطے سے ہمکلام ہوتی ہے اُس سے نہ صرف کیا سے اُس کی والہانہ محبت کا اظہار ہوتا ہے بلکہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے ماحول سے بھی کافی متاثر ہے۔ کہتی ہے ؎

طوطی نلی ! طوطی نلی !!
طوطی نلی ! وش رانگین
وش رنگ دشامیر بازلین
آپ چہ تلاران ءَ وَرَے
چینک چہ پلاران ءَ چنئے
ترانٹی بُران سیر نہ بئے
بیا کہ بران، چینکھت کنان
چینکھت وُتی دست ءِ دل ءَ
آپہہت من زترءِ گدہ ءَ

ایک محرم راز بھیج کر

مجھ سے یہ پوچھا

اُس محرم نے

مجھ سے محبوبہ کے

دردِ فراق کی داستان بیان کی۔

اور یہ بھی کہا؛

اے نوجوان!

اگر تم شیر کی سی ہمّت رکھتے ہو

تو اپنی محبوبہ کے پاس چلے جاؤ۔

کہ وہ گوھرِ نایاب

دلہن کیطرح سنگار کر کے

اپنے امیرانہ گھر کی بالائی منزل میں

تیرے انتظار میں بیٹھی ہوتی ہے۔

بھرام جکرانی بادلوں سے التجا کرتا ہے کہ وہ اُس کی محبوبہ کے خیمے پر جا کر ٹوٹ کر برسیں اور اُسے ادھیڑ کر رکھ دیں۔ کیوں؟ اِس کا جواب بعد میں آئے گا۔ اِس وقت نظم کا یہ حصّہ ملاحظہ ہو، کہتا ہے ؎

گورِ شُما منّت اِنت زری نودان!

سئیل دِ تمبیانی جُھڑی کوشان!

شوا، وُتی سارتین جیھران بوجھت

بوجھت پہ سُلطانین سرءِ حیرءِ

مینہت منی دوست ءِ زرنگین شارءِ

ڈُر دیپ ءَ جنجین گریچھ وگیوار ءَ
ڈُولاں گوں ڈُکانیں گورترءَ ہار ءَ
بُن جنہت نردان! کُھل ءَ پیشدار ءَ

یعنی
اے سمندر سے اُٹھنے والے بادلو!
اور اے طوفان بدوش بادلوں کو اُڑا کر
لانے والی ہواؤ!
مَیں تم سے عرض کرتا ہوں کہ
تم اپنی جھڑیاں کھول دو۔
تم کو،
اُس کے شاہانہ سَر کی قسم
کہ خُوب کُھل کر برسو،
میری محبوبہ کے نرم ریشمی پیراہن کو
اُس دُر دِھن کی ہنس جیسی گردن کو
اُس کی مانگ کو
اُس کے ہاتھوں کی چوڑیوں کو
اور اُس کی بھرپُور چھاتیوں پر پڑے ہُوئے ہار کو
خُوب تر کر دو۔
اور اُس کے خیمے کے اگلے سُتون کو
اُکھاڑ کر پھینک دو۔
کیوں؟ بھرام جکرانی کہتا ہے اِس لئے کہ جب تم ایسا کرو گے تو وہ

Scanned with CamScanner

پریشان ہوگی اور ؎

گریشہ کھل ءِ بانزرءَ کشی

برزءِ شہ ہنبو میں شماں گندی

درو ہتاں گوں عرشی جیہراں شتنی

ہے سلاماں، گوں گورتگیں نوداں۔

یعنی

وہ محبوبہ، اپنے خیمے کے ایک گوشے سے

اپنی خوبصورت گردن باہر نکالے گی۔

اوپر کو

اونچے پہاڑوں کی شاداب گذرگاہوں کی طرف

دیکھے گی۔

تب وہ آسمان سے اُترنے والی جھڑیوں کے ساتھ

یا، برس کر جانے والے بادلوں کے ساتھ

ہم کو اپنا سلام بھیج دے گی۔

توکلی مست کہتا ہے کہ کونجیں سندھ واپس جاتے وقت

کے علاقے پر سے گذریں گی تو اُس کی محبوبہ سمو کو اس کا حال پہنچا دیں گی۔ ان چار بیتوں

توکلی مست نے جو کیفیت بیان کی ہے وہ ہر شاعر کا کام نہیں۔ ان ابیات میں

غم ہجراں، خواہش وصل اور صدق وصفا کے باریک اشارے ملتے ہیں۔ گویا کہ توکلی مس

دریا کو کوزے میں بند کرکے رکھدیا ہے، کہتا ہے: ؎

کونج کہ آئنت، سیٔ کنت لدّو کیں جن ءَ

مست مردچی من گو کنت سندھ ءِ ہلکہاں

گُرائی سندھ ءَ وپولی سمّو ! تئی دروشم ءَ

پولگ ءُ سمّو ! تئی بدل پیدا اگ نہ بیت

یعنی

گُونج گُرلاتی ہے

اور چیخ چیخ کر

اُس سُبک خرام عورت کو اِطلاع دیتی ہے

کہ مست آج کل

سندھ کے علاقوں میں گھوم رہا ہے

اے سمّو !

سندھ میں گھوم پھر کر

وہ تیرے خدوخال جیسی ایک حسینہ تلاش کرتا ہے

مگر سمّو !

ڈھونڈھنے سے

اُسے تیرا ثانی نہیں مِل سکتا۔

بجار، مری قبیلہ کا ایک مشہور شاعر گذرا ہے۔ وہ مشہور رزمیہ گو

رحم علی کا باپ تھا۔ عشقیہ نظمیں کہتا تھا۔ اپنی ایک نظم میں کہتا ہے کہ ایک دن ایک کبُوتر

ں سے اُڑ کر اُس کے پاس آیا، اور اُس سے شکایت کرنے لگا کہ :ے

کُوزت پہ آزاءِ بگا لینیت :

تو پہ چے ھلنج ءَ دَیے دُعاءَ

کہ ترا سیاھکانی گُنت لال ءَ

حال ھوُ دجورین دُشمنان داتہ۔

ماوں تئی حیرین دوست ءَ ربالو

اجن ءِ دروہتان داں تو ءِ کاراج

تی سلامان دی لال ءِ پچتینان۔

یعنی

کبوتر نے بڑے دُکھ سے کہا :

تم اُس مہلنج کو بد دُعائیں کیوں دیتے ہو ؟

اُس حسینہ نے تیرا دل کب میلا کیا ہے

وہ بات تو

تلخ کام دشمنوں کی پھیلائی ہوئی ہے۔

میں تیری خوش شمائل محبوبہ کا قاصد ہوں

اُس کے پیار بھرے بوسے تیرے لئے لاؤں گا

اور تیرے بھی سلام اُس کو پہنچا دوں گا۔

بجار کے جواب کے بغیر اشعار میں لطف نہیں آئے گا۔ کچھ

اور کچھ ندامت کے ملے جُلے جذبے سے کبوتر کے جواب میں بجار کہتا ہے :۔

اِنہ اُو تنگو دروشمین کپتی !

ذاتی مُرگھاں چہ یک تو ءِ راتی !

تو گوں منی زرزیر مہپریں دوست ءَ

ہر دو ءِ من خیرانی تل ءِ باتہت

یعنی

نہیں : اے زرجبین کبوتر نہیں !

تم تو تمام پرندوں کے سرتاج ہو

تمہیں اور میری زنجیر گیسوؤں والی محبوبہ

دونوں کو خیر و عافیت نصیب ہو۔

Scanned with CamScanner

بلوچستان کا مشہور صاحبِ سیف و قلم خان، میر عبداللہ خان احمد زئی،
جن کی قومی نظمیں وطن دوستی اور قوم پروری کے والہانہ جذبات سے بھرپور ہیں بحیثیت شاعر ہونے کے ناطے عاشق مزاج بھی تھے۔ اپنی ایک عشقیہ نظم میں سمندر سے اٹھنے والے بادلوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں: ؎

جی زری نودان! چو شما سیاہتاب وبزت
ہر صبا کائت، بیگہاں سالوکی وزت
گوں زری گوات ءُ گوارت اچ گورِچ ءِ ہزرت۔

جی زری نودان! پہ خداوند ءِ واز کنہت
کیگدیں دوست ءِ، گوں گُگیں ترزیان راز کنہت
کیگد ءِ گیوار ءِ، منی دیما ساز کنہت
آ ہمر ءِ شار ءَ او گورتر ءِ ہار ءَ تر کنہت
شر بگوارت او تنگہیں زردانی آپ دیہت۔

یعنی

جی سمندر سے اُٹھنے والے بادلو!
تم بھی کس قدر سیاہ اور گھنے ہو۔
ہر صبح کو آتے ہو
اور شام کو دولہے کی طرح (برات لے کر)
چلے جاتے ہو۔
بحری ہواؤں سے برستے ہو
لیکن گورِیچ سے ڈر کر بھاگ جاتے ہو۔
جی، سمندر سے اُٹھنے والے بادلو!

ء شمال سے چلنے والی انتہائی سرد اور خشک ہوا - الخ

اور اُس کا حُسن

دِل کے تاروں پہ داغ دیتا ہے۔

محبُوبہ کا حُلیہ بیان کرنے کے بعد مُلّا فاضل اپنا پیغام اِس طرح سُناتا ہے:-

گوَشِش گوں کہیر باتیں ہنگ ءَ
دَابانی گُلیں مہر بنگ ءَ
پیچے نشنگے دِل تنگ ءَ
سَازے چو گو تنسو کلیں چنگ ءَ

یعنی

تم اُس کہیر با صفت گوری سے،
اُس پیاری اداؤں والی مُوش سے
جا کر کہو کہ: اے محبُوبہ!
تُم ہم سے ناراض کیوں ہو،
اور ہم سے لڑنے کو
ہر وقت جنگ کی طرح تیار کیوں رہتی ہو۔

اِس قدر کہنے کے بعد فاضل اپنا جرم تسلیم کر کے اپنی محبُوبہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے اور اُس سے معافی کا خواستگار ہوتا ہے۔ کیونکہ عشق میں محبُوبہ سے دلیل بازی کرنا اور جھگڑا ایک معتوب فعل سمجھا جاتا ہے۔ اُس کے ہر جور و جفا کو برداشت کرنا ہی عاشقِ صادق کا شیوہ ہوتا ہے۔ اپنی محبُوبہ سے رحم کی درخواست کرتے ہوئے مُلّا فاضل کہتا ہے:-

رحم کن شپ چراگھ سرا دانی
گنج و قیمتی نیا وانی
تو ئیگاں تنی یادانی

آسیگوں کمن دُردانگ
نہکیں اشرفی ءِ جیانگ
بالادت لُنگ دیوانگ۔

یعنی

اے گاؤں کا لعلِ شب چراغ!
اور اے اچھی خو و خصلتوں کا گراں قیمت خزانہ
میں تیرے قدموں پر قربان
مجھے جدائی کی اِس آگ میں مت جلا
تم خالص سونے کا ایک سکہ ہو
تیری قامتِ زیبا نے
مجھے تیرا دیوانہ بنا دیا ہے۔
مجھ پر رحم کر۔

مُلّا فاضل رِند اپنے دور کا ایک پُرگو اور باکمال شاعر گذرا ہے۔ اُس نے اُس دور کی بلوچی شاعری کو اپنے کلام سے خوب جلا بخشی ہے۔ اپنی ایک نظم میں قمری سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

دِلکش گرشیں قُمری، بیا سخن دانیں!
زرگُو دلکش آواز و توتی الہانیں!
کپتگ منی بالاد پہ گمے گرانیں
مشکلیں کاراں گرتگ وجیرانیں
ماہلیں دلبرہ دُختر سے جوانیں
ہلکی نزیک ورا ہی آسانیں۔

یعنی

اے خوش گفتار و سخن شناس قمری !

اے خوش الحان اور طوطی کی طرح بولنے والا پرندہ !

آ، کہ مجھ پر

غموں کا ایک بہت بڑا بوجھ آن پڑا ہے۔

میں ایک بہت مشکل کام میں پھنس گیا ہوں۔

اور بہت پریشان ہوں۔

وہ ماہِ پیکر، ایک پیاری لڑکی ہے

اُس کا گھر نزدیک ہے

اور راستہ بھی دشوار گذار نہیں۔

قمری ایک خوبصورت اور خوش آواز پرندہ ہے لیکن کو ماہ پرو
کبوتر کی طرح دُور تک کی لمبی پرواز نہیں کرسکتی۔ اس لئے فاضل اُس سے کہتا ہے اور
محبوبہ کا گھر نزدیک ہے اور راستہ بھی دشوار گذار نہیں کہ تم کو پہاڑوں کے اُوپر سے
کرکے گذرنا پڑے جو تمہارے بس میں نہیں۔ اب مُلّا فاضل قمری کو اپنا پیغام اس طرح

قاصد، منی پیگھاماں ببر چوشءَ

منی سلاماں سرکن زبادموشءَ

تو بکن وسواس تمنّیٰ کوشءَ

من نہ تُرساں تئیَ وارث و خویشءَ

ہُلکءَ نڈھا گور و مرگءَ اندیشءَ۔

یعنی

تو میرا قاصد بن

اور میرا پیغام اُس کے پاس لے جا۔
نرباد کی خوشبو میں بسی ہوئی اس محبوبہ کو
میرا سلام پہنچا
اور اُس سے کہہ دے کہ
تُم اِس سے پریشان مت ہو
کہ میں قتل کر دیا جاؤں گا
(کیوں کہ)
مَیں، نہ تو تمہارے وارثوں
اور رشتہ داروں سے ڈرتا ہوں،
نہ لوگوں کی لعن طعن سے
اور نہ ہی موت کا اندیشہ کرتا ہوں۔

بلوچ شعراء نے عموماً کبوتر سے قاصدی کرنے کا زیادہ کام لیا ہے۔ مُلّا فاضل نے اپنے قاصد موقع و محل کے مُطابق مُنتخب کئے ہیں۔ محبُوبہ کا حال جلد از جلد لانے کے لئے کبوتر سے زیادہ تیز رفتار قاصد اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کسی دُور دیس میں رہنے والی محبوبہ کے پاس بھیجنے کے لئے مُلّا فاضل کبوتر کو بُلا کر کہتا ہے:ے

کپوت چاہی من ءَ گپتگ ہزار کار
گھموں بازنت خیالاں بیتگوں بار
تراسوجے دیاں اُو مُرگھ گوش دار
منی سوج و نصیحتاں دل ءَ دار
چو بسل ءَ وشش رہِن بالانی دوستدار
شپ ءَ درنگان سیاہیں مُہیراں دار

صباح ءِ مہلقا تیں صورت ءِ چار

دا[illegible]نن سرجم ءِ بیار

سلام گو[illegible]ت نزدان ءِ زیریان

علیکم قہر بادان سانوڑ یان

پہ آخو بصورتیں لال ءِ چریان ۔

یعنی

اے کبوتر ! آ

مجھے تم سے ہزاروں کام پڑے ہیں ۔

میرے غم بھی بہت ہیں

اور افکار کا بہت بڑا بوجھ بھی سر پر ہے ۔

اے پرندہ !

میں تم کو جو ایک بات بتاتا ہوں

اُسے اچھی طرح غور سے سُن لو ۔

میری بتلائی ہوئی

اِن باتوں اور نصیحتوں کو

اچھی طرح دِل نشیں کر لو ۔

بلکہ ، اُنہیں

اپنے تیز اُڑنے والے پروں کی طرح عزیز رکھو

جاؤ ، اور جا کر میری محبوبہ کے

رات جیسے کالے کاکلوں پر بیٹھ جاؤ

اُس مہلقا کی

Scanned with CamScanner

سپیدہ سحر جیسی صورت کو دیکھو
اور پھر جلد واپس آ کر
اُس کے دِل کے تمام رازوں کا
مجھ سے انکشاف کرو۔
اَے کبوتر !
سمندر سے اُٹھے ہوئے بادلوں کی طرح
میرا سلام لے جاؤ
اور ساون کے تند و تیز جھکڑوں کی طرح
اُس کا جواب لیکر آؤ
میں اُس خوبصورت لعل کے لئے
دیوانہ ہو چکا ہوں۔

مُلّا فاضل کی ایک اور مشہور نظم ہے جس میں اُس نے کبوتر ہی کو قاصد بنایا ہے۔ اُس کی یہ نظم بہت دِلکش اور بامعنی ہے۔ اِس میں مُلّا فاضل نے بلوچی شاعری کا ایک حسین نقش اُبھارا ہے۔ کہتا ہے :-

کراہگانی چاہی کپوُدر وشں زملین
شر سرو شیشار گردن و شامیر بازلین
چم تئی سھور و ملکشیں گردن بکھلین
آہوُ سا کیں شنہت ہمراز مُبلین
مہلبیں چینکنت تئی و تنگ، ہیر و جاپلین
آپ چہا کھنڈان بشکلین رو دوان بارلین
بیا بزیر دروچتان و بیر بیگھاماں دِلین

اُدواں کہ آہوگی تتارعین نبتّ ماملین

بُزدا برخیزگن ، شاہی بازارءَ ہاملین

پرکھیب نشتنگ مشتلی سنگین مہولین

شرسروبے عیبین سمنبر حُور چاملین

یعنی

اے خوش خرام و خوش آواز کبوتر

اے خوبصورت سر

رنگین گردن

اور خوبصورت پروں والا (پرندہ)

کہ تیری آنکھیں سُرخ

اور گردن مخمل کیطرح نرم و رنگین ہے

اور تیری ہوسناک منقار

بُلبلوں کی ہمراز ہے ۔

تُم ، خوبصورت اور خوشبودار مہلب [1]

لونگ اور الائچی چُگتے ہو

پہاڑی کھڈوں اور طوفان بدوش دریاؤں کا

جاکر پانی پیتے ہو

ذرا میرے پاس بھی آؤ

اور میرا محبت بھرا پیغام وہاں لے جاؤ

---

[1] اسی نام کے درخت کا خوشبودار پھل ۔

جہاں وہ آہوئے تتار جیسی آنکھوں والی

ماہرُو بیٹھی ہوئی ہے۔

تُم اگر بُلند پرواز کر کے جاؤ گے

تو تمہیں

سیلابی ندیوں سے شاداب ایک سرسبز بستی نظر آئے گی

اور وہ گران منزلت ماہرُو

وہ خوبصُورت گیسوؤں والی بے عیب حسینہ

وہ سمبر اور حُور شمائل محبُوبہ

ایک شان و تمکنت سے

وہاں پر بیٹھی ہُوئی ہو گی۔

مُلاّ فاضل آگے چل کر کبُوتر سے کہتا ہے کہ جب تم اُس بستی میں پہنچو تو اپنی خوبصُورت پرسمیٹ کر بلندی سے نیچے اُتر آؤ اور اُس محبُوبہ کے پاس جا کر بیٹھ جاؤ جو ہم سے رنجیدہ خاطر ہے۔ تب بے

مئے سلاماں پہ دُرِ حدیثیں لالءِ گوش

محرم وددتی و دلی اسراداں بگوش؛

گوں من ءِ پچے ءِ جنئے تیراں پہ ٹکش

بے گھباریں ماہ سئے دیکٹ وچار کوشش

چہ دُتی جُنئی ءِ کنار ءِ بوسائے بکھش۔

یعنی

اُس دُشمن اور گراں قیمت لعل سے

میرا سلام کہدو۔

اور ایک دوست اور محرمِ راز کی طرح
اُس سے میرے دل کے اسرار بیان کر دو،
اور اُس سے کہو کہ !

اے دلرُبا !
ہم پر کیوں اپنی نظروں کے
ترچھے تیر چلاتی ہو۔
اور اے چودھویں کا بے غُبار چاند !
مجھے اپنی چُنری کے کنارے کا
ایک بوسہ عنایت کر دو۔

بلوچی کے شعراء میں مُلّا فاضل غالباً پہلا شاعر ہے جس نے ھُدھُد سے بھی پیغام رسانی کا کام لیا ہے۔ ہُدہُد وہ پرندہ ہے جسے حضرت سُلیمان پیغمبر نے اپنا قاصد بنا کر ملکہ بلقیس کے پاس بھیجا تھا۔ اِس مناسبت سے بلوچ اُسے مُرگھ سلیمان یعنی سلیمان کا پرندہ بھی کہتے ہیں۔ اِس کا ایک بلوچی نام شاپی گُروس بھی ہے لیکن مُلّا فاضل نے مُلّا ہونے کے رشتے سے اُسے شاپی گُروس اور مرگھ سلیمان کہنے کے ساتھ ساتھ ہُدہُد بھی کہا ہے۔

نظم سے ظاہر ہوتا ہے کہ مُلّا فاضل اپنی محبُوبہ کو ملکہ بلقیس سے کمتر نہیں سمجھتا اور سمجھنا بھی نہیں چاہیئے ورنہ عاشقی کا دعویٰ کیسا۔ بہرحال، مُلّا فاضل کی محبُوبہ ایک خانہ بدوش خاتون ہے، اُس کے پاس مال ومنال کی فراوانی ہے۔ بھیڑوں، بکریوں، گایوں اور اُونٹوں کے گلّے کے گلّے چراگاہوں میں چھپیلے ہُوئے کِلیلیں کرتے پھرتے ہیں۔ اِس لحاظ سے وہ بلقیس کے پایہ کی عورت ہے اِس لئے بھی اُس کے پاس بھجوانے کے لئے ہُدہُد ہی مناسب قاصد ہو سکتا ہے۔ اِسی پرندے نے حضرت سلیمان کو ملکہ بلقیس سے ملایا تھا۔ تو بعید از اِمکان نہیں کہ مُلّا فاضل کے لئے بھی عقدہ کُشا ثابت ہو۔ چنانچہ کہتا ہے :-

بیا حقیقین ہُد ہُد جانی

رازنگین شاہاں مرغ سُلیمانی

طاہرِ قدسی باغِ رضوانی

رازِ پو رتالو ماہتابانی

سوسن و شبنمی سحابانی

گر و کابی تو چیرہ گاں سُستے

او بلے شاہانی ورد عرض دُرستے۔

یعنی

اے پیارا اور حقیقت آشنا ہُد ہُد !

اے حضرت سلیمان کا پالتو پرندہ !

اے باغِ رضوان کا طائرِ قدسی!

اے مہوش حسیناؤں کا رازدان اور ایلچی !

اے سوسن و شبنم کی لطیف زبان بولنے والا !

تُم میری محبوبہ کے پاس

میرا پیغام لے جانے

اور اُس کا جواب لینے کے لیئے قاصد ہو۔

اگرچہ تُم

عقاب کیطرح تیز پرواز نہیں کر سکتے ہو،

لیکن، شاہانہ درباروں میں پہچانے جاتے ہو۔

مُلّا فاضل کی یہ ہُد ہُد والی نظم بہت مشہور ہے، اِس لئے ذرا تفصیل جائزے کی متقاضی ہے۔ مُلّا فاضل آگے چل کر ہُد ہُد سے کہتا ہے ؎

Scanned with CamScanner

زیڑمی زُپتین پوپل وہیران
بارڑمی بھنگ و بڑنگیں بھیران
بندشس گوں پَچرِ وکیِن چیٹ وہیران
خیزکن بُرزا ، پہ حکمتِ پیران
رِشیگرِ چو سیرائیِ رِشپین تیران ۔

یعنی

اے ہُدہُد !
میرے پیغام جو الائچی اور سُپاری کی طرح
خُوش ذائقہ اور خوشبودار ہیں
اور جن کو میں نے
بارڑی کے "روغنِ" بھنگ
اور (اپنے خیالات کی) کڑکتی ہُوئی بجلیوں میں تَلا ہے ،
میری محبُوبہ کے پاس لے جا۔
اپنے پھڑ پھڑاتے پروں میں اُنہیں باندھ لے
اور پھر پیروں کی کرامات سے
اُوپر (آسمان) کی طرف جھپٹا مار کر
اور سیوائی کمان سے نکلے ہُوئے تیر کی طرح
تیزی سے آگے بڑھ جانا۔

مُلاّ فاضل ہُدہُد سے کہتا ہے کہ جب تم اُوپر کو جھپٹو تو آگے بڑھنے کے لئے

---

[1] درۂ بولان کا ایک نخلستان جہاں کی بھنگ مشہور ہے ۔ ا۔ح
[2] قلات کا قدیم راجا ، جس کے نام سے قلات سیوا مشہور ہے ۔ ا۔ح

ں ایک خاص راستہ اختیار کر لینا تاکہ تمہیں پرواز میں آسانی ہو۔ وہ آسان اور فضائی راستہ

رتا ہے۔ مُلّا فاضل کہتا ہے: ؎

جبل اُش گرتند ان ورُزچہ مات بندان
مان گورزان بے چہ تیہریں سندان
کشے اچ کوہی ڈُومگان دندان
شر خیال کن کہ دیر نہ اِنت چیندان
گِندے ہنکین ومہتری ہندان۔

یعنی:

گرجنے والے بادلوں کے نیچے سے
اور اُونچے سلسلہ ہای کوہ کے لمبے ڈھلوانوں
اور دندانہ دار بلند چوٹیوں کے اُوپر سے
گذر کر چلے جانا۔
جلد تو دیکھ لے گا کہ
وہ مقام جو تیری منزل ہے،
زیادہ دُور نہیں۔
بہت جلد اُن کی قیام گاہیں
اور سبزہ زار چراگاہیں تجھے نظر آئیں گی۔

اُن قیام گاہوں اور چراگاہوں میں کون لوگ رہتے ہیں؟ مُلّا فاضل ایک
ہر دل نشین انداز میں اُن کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے: ؎

نگُفزار پیدا کنت نگھار ڈکوٹین
سرشم و مُہنبوتیں دیار مورتین

جامنسد گہتیں مہتر تنت ہوتیں

بیبرش کمان تنت و کنگر نت جوتیں۔

یعنی کہ

تم اُس مرغزار کو بالآخر دیکھ لوگے

جہاں پہاڑ کے دامن میں

ایک سنگین قلعہ ایستادہ ہے۔

جہاں کی آبادی گنجان

اور زمین سرسبز و پُر مہک ہے۔

اور اُس میں قدیم ہوت (قبیلہ کے) امیروں کا

ایک ایسا گھرانہ بستا ہے

جن کی کمانیں، کڑکتی ہوئی بجلیاں ہیں

اور جو بہت بڑے بے پرواہ اور نڈر لوگ ہیں۔

فاضل آگے چل کر ہُدہُد کو ہدایت کرتا ہے کہ جب تم اُس سرسبز و شاد
وادی میں پہنچو تو نیچے اُترتے وقت احتیاط اور ادب کو ملحوظ رکھنا۔ کیونکہ وہاں پر بسنے وال
بڑے باعزت اور مالدار لوگ ہیں اُن کے مال و مویشی جو وادی میں چر رہے ہیں بدک نہ جائ
اور وہ لوگ ناراض ہوکر تم کو کوئی گزند نہ پہنچائیں۔

یہاں پر اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ہُدہُد کوئی سیمرغ نہیں
اُس کے پروں کی آواز اور جسامت سے مویشی بدکیں، بلکہ شاعر اُسے اُس وادی کے لوگوں کی
اور غصیلی طبیعت سے واقف کرانا چاہتا ہے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ محتاط رہے۔ بہرحال مُلا فاض
ہُدہُد سے کہتا ہے :-

پہ اَدب المانیں پہاں نزار

پہ کمے نند دد بیلگاں وازار
مُجلگھیں جا وجاگہاں ستبار
شابُزاں شنت وشیہاں ریبار
چتوّاں کردو مُودگاں اِلگھار
جلڑّاں ترانج وگورگُشاں گیسار
مِسکیں میدان وشرونگیں بازار
دورگمان تنت وشش تمکنت آچار
یک گورترے مالَ ویک گورڑے مال دار
پیشدُراں پیدا اکنت پری دیدار
آکہیبانی سُتچہ تمیں شیشار۔

یعنی:

وہاں پہنچ کر
تم اپنے خوبصورت پروں کو
نیچے اُترنے کے لیے سمیٹ لو۔
تھوڑی دیر سستانے کو کہیں بیٹھ جاؤ
مگر، اپنی آنکھیں کھُلی رکھو
اُس حسین وادی کو
اور، اُن، مقامات کو غور سے دیکھو
جہاں اچھی نسل کی بکریوں اور بھیڑوں کے
گلّے کے گلّے چر رہے ہیں
لیلوں اور برّوں کی ٹولیاں علیحدہ ہیں

جو سبزہ زار میں کلیلیں کرتی پھرتی ہیں۔
اصیل گھوڑیاں اور اُن کی بچھیریاں
جُدا اچھلتی کودتی ہیں
گور کے شکار میں استعمال ہونے والے گھوڑے
جُدا تھانوں پر بندھے ہنہناتے ہیں
پہاڑوں کے سیاہی مائل دامنوں میں
کالے خیموںؔ کی بستیاں آباد ہیں۔
وادی میں یہ خیمے ایسے لگتے ہیں
جیسے سمندر میں کشتیوں نے
کالے بادبان کھول رکھے ہوں
اور جن کے بیچ بیچ پٹّوں کو سنبھالے ہوئے مستول
کمان کی طرح جھکے ہوئے ہوں۔
اِن خیموں کی ایک طرف
اگر بھیڑ بکریوں کے گلے چرتے نظر آتے ہیں
تو دوسری طرف
مالدار خود کچہریؔ لگائے بیٹھے ہیں۔
اور خیموں کے پیش دروں میں
پریوش، بلند قامت اور ناز و ادا والی
حسینائیں بیٹھی ہوتی ہوں گی۔

ا؎ بلوچی گدان۔ الخ ۲؎ دیوان، مجلس

مُلّا فاضل، ہُدہُد سے کہتا ہے کہ جب تم یہ سب کچھ اچھی طرح دیکھ چکو تب وہاں سے اُڑ کر میری محبوبہ کے پاس جاؤ جو اِن خیموں میں سے بہترین خیمے میں رہتی ہے۔ آہستہ سے اُس کے پاس جا کر بیٹھ جاؤ اور کہو

بازنگوتش فودءَ سیلہانیگءَ
روضہءِ بگھدادءَ جنانیگءَ
ٹیپل دمورتءَ سرشانیگءَ
سرمنی سودایان شترانجیسنان
گپتگ مہ مات بندان گندیشان
گھم خیالے و عاشقی جاڑے
اے دِگر شغل و آدِگر کارے

یعنی

اب تم جا کر اُس حسینہ کو
جو بادلوں کی طرح سُبک خرام ہے،
اُس عورت کو
جو روضہءِ بغداد کی طرح مقدس ہے،
اُس نازنین ہرنی
اور چٹانوں پر اُگنے والی مورٹ[1] کی بیل کو
میرا پیغام پہنچا دو۔
(اُس سے کہو کہ)

---

[1] ایک خوبصورت بیل جس کے پتوں کو پیس کر پاؤڈر کی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ (انجم)

میرے سر میں تیرے عشق کا سودا سمایا ہے
اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ
میں اُونچے سلسلہ کوہ کی ایک چوٹی سے
پھسل کر نیچے آ گرا ہوں۔
مجھے دُنیا کا کوئی غم نہیں
اس لیے کہ غمِ دُنیا تو محض ایک خیال ہے
البتہ غمِ عشق میں مبتلا ضرور ہوں
اس لیے کہ عشق ایک شوق ہے۔
(اگرچہ غم دونوں میں مُشترک ہے)
لیکن، غمِ دنیا اور ہے
اور غمِ عشق ایک دُوسری چیز۔

یہاں پر یہ ذکر کرنا بے جا نہیں ہوگا کہ اسی خیال کو زرگر حسن کیچی نے
اپنی ایک نظم میں پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

شاعری کشفے، اگر کسے پہ وَت بست کنت
خالق ءِ فضل ءِ، منجل ءَ حوناں گرتست کنت
عاشقی جاڑے کہ خیالاں مَنت کنت
گمِ ہما بارِنت کہ رگ و بنداں سُست کنت۔

یعنی

شاعری ایک کشف ہے
اور یہ کشف اُسے ہوتا ہے کہ خُدا کا فضل
جس کے شاملِ حال ہو۔

اور جو دل میں
دیگچے کی طرح اپنا خون اُبال سکتا ہو۔
عاشقی ایک ایسا شوق ہے جو
جذبات کو اُبھارتا ہے۔
اور غم (دُنیا) ایک ایسا بوجھ ہے
جو (انسان) کے رگ و پے کو سُست کر دیتا ہے۔

بہرحال، مُلّا فاضل اپنا پیغام جاری رکھتے ہوئے ہُدہُد سے مزید یہ بھی کہتا ہے کہ میری محبوبہ سے آخیر میں کہہ دو کہ:

سر پچو ابان و ماجیناں میتان
گنچتاں ، شرّمن گدہ ءُ گیتان
گوھریں شھداں پہ لب نوشان
من وُتی جان ءَ پہ نمت پوشان
سی نہ مانت ورتے ءُ بوشتان
پہ نہ کنیزاں چہ وعدے دوستان

یعنی
اگر (میں اِس قدر بوڑھا اور ضعیف ہو جاؤں)
کہ میرا سر ہلنے لگے
اور میں پیالے میں
تِل ملا کر معجون بناؤں
اور شہد کے ساتھ اُسے ملا کر چاٹ لیا کروں
تاکہ اپنے ہوش و حواس قائم رکھ سکوں۔

یا، میں تارکُ الدُّنیا ہو کر
نَمَد پوش (صُوفی) بَن جاؤں۔
یا، بڑھاپے کی وجہ سے
میرے مُنہ میں تیس[۳۰] دانت نہ رہیں۔
اور عَصا کا سہارا لئے بغیر
میں دو پاؤں پر کھڑا نہ رہ سکوں
پھر بھی، اے میری محبوبہ
میں دوستوں کے ساتھ کئے ہُوئے
اپنے وَعدوں سے پیچھے ہٹنے والا نہیں ہوں۔

۵

صفاتِ یار کے بیان میں

یہ بات انسانی جبلت میں ہے کہ جو چیز اُسے پسند آئے، اچھی لگے، پیاری ہو وہ اُسے پیار کا کوئی نام دے ڈالتا ہے۔ شاعر جو عام انسان سے زیادہ حساس ہوتا ہے اس میں یہ جبلت کچھ زیادہ ہوتی ہے۔ وہ جب اپنی محبوبہ کو ائل (انرل) بُھتل (پھول) اور ہملنج (ماہِ شب تار) کہتا ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اُس کی محبوبہ میں یہ صفت یا ایسی صفات موجود ہیں شاعروں کی زبان میں اسے تشبیہ کہتے ہیں۔

بلوچی، ایک زندہ اور جاندار زبان ہے۔ اس میں سلاست بھی ہے اور فصاحت بھی۔ بلوچی کا ایک ناخواندہ شاعر زبان و بیان کی جو جولانیاں دکھلاتا ہے اور جو تشبیہات و استعارات استعمال کرتا ہے وہ کسی طرح بھی نوشت و خواند کی کسی اور زبان کی وسعتوں سے کم وسیع معنی نہیں رکھتے۔

گو کہ قدیم یا کلاسیکی بلوچی شاعری ردیف و قوافی کی پابند نہیں تھی اور جدید علم العروض کی کسوٹی پر بسا اوقات بعض اشعار پورے نہیں اُترتے لیکن اُن میں جو سلاست، فصاحت اور بلاغت ہوتی ہے اور تشبیہات استعمال ہوتی ہیں وہ قابلِ ستائش ضرور ہیں۔ جہاں تک علم العروض کا تعلق ہے بلوچی کے خود اپنے قواعدِ شعری ہوتے ہیں۔ مثلاً، بلوچی شعر میں ہر بیت مکمل ہوتا ہے یعنی پورے معنی دیتا ہے اور جو شعر یا جیسا کہ بلوچ کہتے ہیں زیمر یعنی نغمگی کے مطابق ہوتا ہے البتہ آج کل جب کہ اُردو اور فارسی شاعری کی تقلید میں ردیف و قافیہ کا استعمال عام ہو رہا ہے تو بلوچی کی لے اور زیمر کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ شاید اب اس کی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ پہلے

Scanned with CamScanner

گُرنگ منءَ وسلِ گنوک۔

یعنی

ہانی، لڑکیوں کی سرغنہ ہے

وہ سوئے ہوئے دِلوں کو جگانے والی

اور اندھیری راتوں کی چمکنے والی بجلی ہے۔

اُس نے مجھے اپنا دیوانہ بنالیا ہے۔

ایک بار شے مرید کی باتوں سے ناراض ہو کر اُس کا باپ شے مبارک اُسے سر
جوتا مار دیتا ہے۔ مُرید غصے سے پیچ و تاب کھاتا ہے مگر بوڑھے باپ کے سامنے بے بس ہو کر
صرف اتنا کہتا ہے کہ:۔

اُبّو منی! بابو منی!
تو کہ نہ دیستہ دوستءِ منی

ہانیءَ بامانی سری
گُٹورِ چتین سُومری

بُرتے مُدی اِحیر و پری۔
تو کہ بدیستین دوستءِ منی

ہان جانِ لُڈو کین پری
گُٹین سر و بوریں گلاہ
پنچگانی گارت کتین
شلوار کہ بیسنڈ ور کتین
گُرنکیںءَ درائیں چاپ جتین۔

یعنی

اے میرے ابّا !

اے میرے بابا !

افسوس کہ تم نے میرا دوست دیکھا ہی نہیں

تم نے ہانی کو

جو سپیدۂ سحر کی مانند ہے

جو ایک ایسی نازنین ہے جس کی آنکھیں

بھیڑ کی آنکھوں جیسی ہیں۔

جس کے بدن سے خوشبوؤں کی مہک اٹھتی ہے

جو ایک حُور اور ایک پری ہے۔

کبھی دیکھا ہی نہیں۔

اگر تم میرے دوست کو

اُس پری وش اور سُبک خرام ہانی کو

ایک بار دیکھ لیتے

تو نہ صرف اپنا یہ منڈا ہوا سر

اور اپنی یہ شُتری ٹوپی

ناچ، ناچ کر گم کر دیتے۔

بلکہ، اپنی پھٹی پُرانی شلوار کا یہ چیتھڑا بھی

اُتار کر پھینک دیتے۔

اور ننگا ناچنے لگ جاتے۔

اگر مُریدِ، ہانی کا دیوانہ تھا تو ہانی بھی سوجان سے اس پر فدا تھی - ایک دفعہ جب میر چاکر نے ہانی کو بہت تنگ کیا کہ آخر مُرید میں اُس نے کیا خُوبی دیکھی ہے کہ

اُس کی دیوانی ہو چکی ہے۔ ہانی نے بہت مختصر لفظوں میں ایک ایسا مسکت جواب دیا کہ مرید

کے ہوش اُڑ گئے۔ ہانی نے کہا :-

سَیٓ یاں کہ تو میرہ چاکرے

رند ءِ توری ئیں واجہ ئے

بلے ، شئے مرید ءِ مٹ نہ ئے۔

یعنی

میں جانتی ہوں کہ تم میر چاکر ہو ،

رِند قبیلے کے طاقتور سَردار اور مالک ہو ،

لیکن ، تم اُس درویش مُرید کے برابر کے نہیں ہو۔

اوٹ سے چھپ چھُپ کر لڑکیوں کو دیکھنا ، نوجوانوں کی ایک عام عادت

ایک دفعہ ایک شاعر نے جس کا نام معلوم نہیں کسی گوشے میں بیٹھ کر اپنی محبوبہ کے دیدار

اپنی آنکھوں کو نوازا۔ اُس واقعہ کو بیان کرتے ہُوئے خود کہتا ہے کہ :-

اَندری جائے نشتگاں پیداکت پری

دسگہار زکان مُچ اتنت درستیں [3] سے صدی

لال گُلیں طوطی ، وَت پاسنیل ءِ سنبہی

سازا تنت لعل وچنگ اتنت ایران ءِ رہی

کاگھدیں دیباشس سُنگ اتنت چارگُل وکُرچی

بُرز باگتاں درنگ اتنت چادشیں نگی

زیب وا ، لال ورنگ اتنت ململ خاسہی

لال کھندیت داج دپ گی یاقوت رچی۔

ماہ درفہتابے لال گونہا بھلاان درشی ،

مُرگھ تا ہُوس سیتے۔ نیست تتی ہمسر سُومری۔

یعنی

میں چھُپ کر ایک جگہ بیٹھا ہوا تھا

کہ پری رُو آتی ہوئی نظر آئی۔

اُس کی سہیلیاں

جو کُل تین سَو تھیں اُس کے ساتھ تھیں۔

وہ پھُول کی طرح نازک ٹولی

بن ٹھن کر سَیر کو نکلی تھی۔

اُس کے ہونٹ سُرخ

اور اُس کی زُلفیں گھنگریالی تھیں

اُس کے کاغذ جیسے سفید چہرے پر

جھُومر اور ٹیکا آویزاں تھے۔

کانوں میں نگینے والے جھُمکے پڑے ہُوئے تھے۔

وہ سُرخ و سفید حسینہ

خاصہ ململ کے سُرخ رنگے ہُوئے دوپٹّہ میں

بڑی خوبصُورت لگ رہی تھی۔

جب وہ ہنستی

تو ایسا لگتا کہ اس کے مُنہ سے

یاقُوت جھڑ رہے ہیں۔

وہ حسینہ، چاند اور چاندنی کی طرح

پھُولوں میں دمک رہی تھی۔

Scanned with CamScanner

اُس کی دیوانی ہو چکی ہے۔ ہانی نے بہت مختصر لفظوں میں ایک ایسا مسکت جواب دیا کہ

کے ہوش اُڑ گئے۔ ہانی نے کہا ہے

سئی یاں کہ تو میہ چاکرے

رِندہ توی تمیں واجہ یے

بلے، اشئے مریدہ مَٹ نہ یے۔

یعنی

میں جانتی ہوں کہ تم میرے چاکر ہو،

رِند قبیلے کے طاقتور سردار اور مالک ہو،

لیکن، تم اُس درویش مُرید کے برابر کے نہیں ہو۔

اوٹ سے چھپ چھُپ کر لڑکیوں کو دیکھنا، نوجوانوں کی ایک عام عادت ہے

ایک دفعہ ایک شاعر نے جس کا نام معلوم نہیں کسی گوشے میں بیٹھ کر اپنی محبوبہ کے دیدار سے

اپنی آنکھوں کو نوازا۔ اِس واقعہ کو بیان کرتے ہُوئے خود کہتا ہے کہ ؛ ہے

اُندری جاتے نشتگاں پیدا کت پُری

دسگہار دُکان مُچ اتنت دِرستیں تے صدی

لال گُلیں طوطی، وَت پہ اسّیل دِ سنبھی

سازاتنت لعل وچنگ اتنت ایران رہبی

کالھدیں دیبا اشں شکّ اتنت چار گُل وکرٹی

بُرز بہ اگناں درنگ اتنت چادشیں تیّ

زیب دا، لال ورنگ اتنت ململ خاصہی

لال بکھندیت داج دپ ئی یا قوت رچی۔

ماہ دمھتا بے لال گوشما پھلّان درّبی،

مرگھ تا ہوس سیئے ، نیست تی ہمسر سومری ۔

یعنی

میں چھپ کر ایک جگہ بیٹھا ہوا تھا

کہ پری رو آتی ہوئی نظر آئی ۔

اُس کی سہیلیاں

جو کُل تین سو تھیں اُس کے ساتھ تھیں ۔

وہ پھول کی طرح نازک طولی

بن ٹھن کر سیر کو نکلی تھی ۔

اُس کے ہونٹ سُرخ

اور اُس کی زلفیں گھنگریالی تھیں

اُس کے کاغذ جیسے سفید چہرے پر

جھومر اور ٹیکا آویزاں تھے ۔

کانوں میں نگینے والے جھمکے پڑے ہوئے تھے ۔

وہ سُرخ و سفید حسینہ

خاصہ ململ کے سُرخ رنگے ہوئے دوپٹہ میں

بڑی خوبصورت لگ رہی تھی ۔

جب وہ ہنستی

تو ایسا لگتا کہ اس کے مُنہ سے

یاقوت جھڑ رہے ہیں ۔

وہ حسینہ ، چاند اور چاندنی کی طرح

پھولوں میں دمک رہی تھی ۔

Scanned with CamScanner

اے حسینہ !

تم حُسنِ خاذس ہو

تمہارا ثانی کوئی نہیں ہے

جام دُرّک نے اپنی محبوبہ کی صفات طرح طرح سے بیان کی ہیں۔ ایک نظم

میں اپنی محبوبہ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے

بیڑہ ءِ پنچیر اگھ ، پُھر پور

سیاہمار چوٹو ودر تشک ءُ بر

کاڈانی گھنبین کوتتر ۔

یعنی

اے میری قابلِ فخر محبوبہ !

تم گاؤں کا لعلِ شب چراغ ہو

تیرے گیسو کالے ناگ کی مانند ہیں

تم درخت کا میٹھا پھل ہو ،

تم حسین عورتوں میں چیدہ

اور بہترین عورت ہو ۔

ایک دن ڈھاڈر کے بازار میں جام دُرّک ایک ہندو حسینہ کو دیکھ لیتا ہے

اور اُسے دل دے بیٹھتا ہے۔ اس حسینہ کی شان میں دُرّک نے ایک دو بڑی خوبصورت

نظمیں کہی ہیں۔ پہلی نظم اس ہندو حسینہ سے مُڈ بھیڑ کے بیان میں ہے۔ کہتا ہے ۔

روچے رفتگاں پہ کارءَ

گنجین ڈھاڈرءِ دربارءَ

شکھے دیتگاں بازارءَ

گُرتی و سرِ گیپ دشارءَ

پیچ ءِ ونت وَتی گیموارءَ

جنتی بشانُوءِ زُنّارءَ

رُشِّس لال اَتنت گلنارءَ

شہی کنت مُشاگ ءِ وارءَ

پوزی دراجِن چوکٹارءَ ۔

یعنی

ایک دن میں کسی کام کے لئے

گنجوں والے ڈھاڈر کے دربار میں گیا ۔

بازار میں مَیں نے ایک دوشیزہ دیکھی

جو گُرتی[1] اور ریشمی دوپٹہ پہنے ہوئے تھی

اپنے گیسوؤں کو گوندھ کر

اُس نے زنّار کی طرح شانوں پہ ڈال رکھا تھا ۔

اُس کے ہونٹ انار کے پھول کی طرح سرخ تھے ،

جن پر اُس نے دنداسہ مَلا ہوا تھا

اُس کی ناک کٹار جیسی تھی ۔

جام درک اپنی محبوبہ کی تعریف میں کبھی بخل سے کام نہیں لیتا ۔ جب بھی موج میں آ کر اُس کی صفات اور رنگ و رُوپ کا بیان چھیڑتا ہے تو الفاظ میں جان ڈال دیتا ہے اور اُن میں ایسے معنی پیدا کر دیتا ہے کہ حُسن مجسّم بن کر سامنے آتا ہے ۔ ملاحظہ ہو اپنی محبوبہ کی جادو چشم

---

[1] چھوٹی قمیص جو کچھی کی ہندو عورتیں پہنتی ہیں ۔ قلات اور دوسرے علاقوں کی ہندو عورتیں بلوچی جامگ یا پشک پہنتی رہیں ۔ الخ

سے متاثر ہو کر کہتا ہے :-

مروچی پہ شرم و داباں رستہ دلبر
جمال تاج سر سلطان شاہپر
نہ شنہ مسل قدش در رنگ صنوبر
نچی دارد دعوائے شمشاد و در وز
پرے نازاں انت آ ، مانند ازگر
کمند پہ کو پچان تنت زلف عنبر۔
پرے زیبان و شان شاہ خوبان
بیان چکر کنان حسن ءِ ستابان
اُفشنگ حورین ، چو سلطان سلیمان
پہ حکمت کنیز داریت جن ءُ دیہان۔
جنفتی عاشقان ، مژگانی چو تیر۔
کنفت بازیں گمر بیاں جاتے تکبیر۔

پیافیں انفنی چو تیزیں کا مار
میانجی ءِ مں چجاں چو کہ سردار
دُر و موتی وجائیں تاج سرور
پری ئے نشتگیں پہ حوض کوثر
دو تیں لب لالنتی ، دنتانی جوہر
گلیں گفتاری پہ شیریں زبانءَ
نہ گنفت طوطی شکر نتوزمی اشان ءَ۔
دو پستان سینہ تہ مثل انار ءَ

بستاہاں گیشتی زیب اش بیان ءُ
فدایاں من پہ آ گوتری میان ءُ۔
قدم زیریت پہ ناز و لوڈ و رفتار
رواج ءِ بیتگنت بیتی نگوں سار
من ءِ گوں ظالمیں زیب ءِ گتہ گار۔
ہنالاں پہ تتی گنڈین زنی ءُ !
چیر ڈے موجیں دل ءِ ذرتہ منی ءُ۔

یعنی

آج میں نے دلبر کی جاہ و حشم دیکھی !
وہ ایک شاہانہ شوکت اور شان کے مالک ،
سُلطان کے سر کے تاج کے حُسن و جمال کی مانند
جلوہ افروز تھی۔
صنوبر کا درخت
جب اُس کی قامت زیبا جیسا نہیں
تو شمشاد اُس کی برابری کا کیا دعوی کر سکتا ہے۔
اُس کی ادائیں سُرخ انگاروں کی طرح جلاتی تھیں۔
اُس کی عنبریں زُلفیں
کمند کی طرح اُس کے شانوں پر پڑی ہوئی تھیں۔
وہ زیب و شان میں شاہِ خوباں تھی۔
میں کہاں تک اُس کے حُسن کی تعریف کروں ،
اُس کی پیشانی پہ تو حضرت سلیمان بادشاہ کی مہر لگی ہوئی ہے۔

جس کی حکمت سے
وہ جنوں اور دیوؤں کو بھی اسیر کر لیتی ہے۔
اُس کی پلکیں،
عاشقوں پر تیر چلاتی ہیں
اور کتنی غریبوں کو قربان کر دیتی ہیں۔
اُس کی ستواں ناک
کٹار کی طرح ہے۔
جو اُس کی دونوں آنکھوں کے درمیان
سردار کی طرح کھڑی ہے۔
وہ، بادشاہ کے سر کا تاج ہے
اُس کے مُنہ سے دُرّ اور موتی جھڑتے ہیں
وہ ایک پری ہے
جو حوضِ کوثر کے کنارے بیٹھی ہوئی ہے
اُس کے دونوں ہونٹ سُرخ
اور دانت گوہر کی طرح چمکدار ہیں
وہ، ایسی شیریں زبان ہے کہ
اُس کے مُنہ سے پھول جھڑتے ہیں
اُس کے دونوں پستان
سینے پر انار کی طرح ہیں۔
اُس کی اور زیادہ تعریف میں کیسے کروں کہ
میرے زورِ بیان سے باہر ہے۔

Scanned with CamScanner

اُس کی زنبور جیسی کمر پہ
میں فدا ہو چکا ہوں۔
وہ ایک ناز سے
جھوم جھوم کر تھرکتی ہے
اور اِٹھلا اِٹھلا کر چلتی ہے۔
اُس کی چال پہ
ہنسنیاں سرنگوں ہو چکی ہیں۔
اُن کے ظالم حُسن نے
مجھے تباہ کر دیا ہے۔
اے محبُوبہ!
تیرا چاہِ زنخدان دیکھ کر
میرا دِل باغ باغ ہوتا ہے۔
اور اُس میں
ایک طُوفان موجزن ہوتا ہے۔

جام دُرک اپنی محبُوبہ کی ستائش کرنے سے نہیں تھکتا۔ وہ زبان کا مالک اور مُلکِ سُخن کا بادشاہ ہے۔ طرح طرح سے اپنی محبُوبہ کو سنوارتا، دیکھتا اور اُس کے حُسن کے گیت گاتا ہے۔ ایک اور نظم میں کہتا ہے:ـــ

مرو چی دوست مں دا بانی دماگھان
گرنتّے گراں قیمتیں لالے بدخشان
نیرزی نہر چی پہ تکّعیں فُلُوسان
خریداری مناں جوہر فروشان!

یعنی

آج میری محبوبہ کے ناز و ادائیں

ستم ڈھا رہی تھیں۔

یوں لگتا کہ

وہ بدخشاں کا ایک گراں قیمت لعل ہے۔

ایسا لعل، جس کے لئے

ایک لاکھ فلوس کی کوئی حیثیت نہیں

اے جوہر فروشو!

اُس کا خریدار صرف میں ہوں۔

جام دُرک اپنی محبوبہ کو ہر رنگ میں دیکھتا ہے۔ ایک دفعہ جب اُس کی محبوبہ بناؤ سنگار کرکے نکلی تو جام دُرک اُسے دیکھ کر تڑپ اُٹھا۔ محبوبہ کی مہک نے اُسے بےخود کر دیا، اسی عالمِ بےخودی میں اُس نے ایک بڑی خوبصورت نظم کہی ہے، جس کے چند بیت ملاحظہ ہوں، کہتا ہے:-

زبادان مں اَت دعطر و دَلیلان

جتئی سیکل پہ تیلان و پُلیلان

تزِ پی مں میز ءُ گران قیمتیں ءَ

شہال روگنت من کوچ ءَ بیرمین ءُ۔

یعنی

وہ عطر و زباد اور دوسری خوشبوؤں میں

بسی ہوئی تھی۔

اُس نے اپنے چہرہ کو صاف و سنگار کیا تھا؛

بالوں پہ خوشبودار تیل
اور جسم پر عطریات مَل کر نکلی تھی
گراں قیمت ملبوسات میں
وہ دمک رہی تھی۔
اُس کے سڈول شانوں پر پڑے ہوئے گیسو
اپنا جلوہ دکھا رہے تھے۔

جام دُرک کی محبوبہ جب باغ کی سیر کو نکلتی ہے تو ہر ایک کی نظریں اُس کی طرف اُٹھتی ہیں۔ جام دُرک پریشان ہو جاتا ہے کہ کہیں اُس کی محبوبہ کو لوگوں کی نظر نہ لگ جائے لیکن جب اُس کی گردن میں پڑے ہوئے تعویذ کو دیکھ لیتا ہے تو مطمئن ہو جاتا ہے کہ اُس نے نظرِ بد سے بچنے کا انتظام کر لیا ہے۔ کہتا ہے :-

نظر کہ تکمین زرّ یں ماتان
گُتی مَن کا مُکاں شمشاد کُلبان
کھجل ہستہ چوفتہ سرو بوستان
گُتی چندی چکوراں سر پریشان۔

یعنی

اُس نے نظرِ بد سے بچنے کو
چاندی کے تعویذ پہن رکھے تھے
اُس کی قامتِ زیبا پہ
شمشاد قربان ہو رہا تھا
وہ گلستان کے پھولوں میں گُلِ لالہ کی مثال تھی
اُس کے قد و قامت کے سامنے

سروِ بوستان اپنا سر جھکا رہا تھا
وہ چاند کی مثال تھی
کئی چکور اُس کے لیے پریشان ہو رہے تھے۔

عاشق کو اگر ہم شکی مزاج اور وہمی نہ بھی کہیں تو بھی اِس حقیقت میں ک[...] فرق نہیں پڑتا کہ وہ اپنی محبوبہ سے متعلق ہمیشہ طرح طرح کی غلط فہمیوں میں مبتلا رہتا ہے۔ [...] ہمیشہ یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ محبوبہ اُسے بھول جائے یا اُس سے بیوفائی کرے [...] جب اُسے ایسا خیال آتا ہے تو وہ جام دُرک کی طرح گڑگڑا کر اپنی محبوبہ سے التجا کرتا ہے:

تئی سلطان، من تئی پائے خاکان
من ءُ یکدم مبر چیہ پکر و ہوشان
نہ اَچ زرد ءِ، من ءِ لاڈی! اشمو شان۔

یعنی

اے میری محبوبہ! تم سلطان ہو
اور میں تیری خاکِ پا ہوں۔
مجھے تھوڑی دیر کے لیے بھی
اپنے فکر و خیال سے دُور نہ رکھو
اور نہ ہی، اے لاڈوں والی!
ایک لمحہ کے لیے بھی
مجھے اپنے دل سے بُھلاؤ۔

جام دُرک کی نظموں میں دھنک کا رنگ جھلکتا ہے۔ جب بھی ا[...] محبوبہ کے حُسن و دلرُبائی کا ذکر چھیڑتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ ایک غواص سمندر کی گہرائیوں میں ڈ[...] دُرہائے معانی ڈھونڈھ نکالتا ہے اور پھر اُن کو ایک لڑی میں پرو کر اُس شاہِ خوباں کو پیش[...]

Scanned with CamScanner

ہے جو اُس کی جانِ آرزو ہے۔ مثال کے طور پر اُس کی یہ نظم ملاحظہ ہو، کہتا ہے :-

سنگین وسیاہمار چوٹین
وشں قدّ و آہو گردنین
چہ گوشتن ء ، دست و سَرین۔
بانُک گلین ، دُرِ نگین
جامِ دُرَک ء اَرواح وگین
وشں بو و نہتابی جبین
نا ، بیوفاوَن بالیقین
لُطف ء نظر مارا ببین۔
تؤ بادشاہِ بے گُزر
جوانَ ہنت تئ باز ناز و فر
اَلبہ ، تئ رُوح اِنت بشر
بر من بکُن مہر ء نظر۔

یعنی

میری محبُوبہ ! بہت ہی سنجیدہ اور بُردبار ہے
اُس کے گیسُو کالے ناگ جیسے ہیں
اُس کا قد موزُوں
اور گردن ہرنی کی گردن جیسی ہے
میں اُس کی کیا تعریف کروں کہ
وہ میرے زورِ بیاں سے کہیں ہاتھ آگے ہے۔
وہ پھُولوں کی بانو

Scanned with CamScanner

اور نگینے کا موتی ہے۔

وہ جام درک کی روح اور زندگی ہے

اُس کا بدن مہکتا ہے

اُس کا چہرہ چاند کی طرح دمکتا ہے

اے محبوبہ!

ہم یقیناً ہیوفا ہیں

لیکن پھر بھی

تم ہم پر اپنی رحم کی نظر ڈالو

کیونکہ تم بے غرض بادشاہ ہو۔

گو کہ تمہاری ادائیں

اور شان و شوکت افلاکی ہیں

مگر تمہاری روح تو بشر کی ہے

اِس لئے ہم پر (جو خطاکار بشر ہیں)

اپنی محبت کی نظر ڈالو۔

بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ عالمِ بیداری میں محبوبہ تک رسائی ممکن نہیں ہو سکتی لیکن عالمِ خواب میں محبوبہ کے پاس جانے اور اُس کا دیدار کرنے سے عاشق کو کوئی نہیں روک سکتا۔ اِس خیال کا اظہار جام درک اِس طرح کرتا ہے۔ کہتا ہے:

دوشی پہ خیالِ نوکیں

دیستوں مروشے لُڈو کین

گھندیت ور جنیت مروارید

جُزبیت گُڑزمین رد کِ بیت

شیر ہا تنگداں دوست ءِ رکّ
داب ءِ چہ گنتوں سُتھ و سار ۔

یعنی
گذشتہ شب
میں نے اپنی شبابِ خرام محبوبہ کو
ایک نئے انداز سے دیکھا ۔
وہ ہنستی تھی
تو موتیوں کی جھڑی لگ جاتی تھی
وہ چلتی تھی
تو زمین دمکنے لگتی تھی
میں نے محبوبہ کے ہونٹوں کا رس
دودھ کی طرح گھونٹ بھر بھر کر پیا ۔
اور خواب سے بیدار ہُوا ۔

ڈیرہ غازی خان کا خانے بزدار اپنے دور کا ایک بلند پایہ شاعر گذرا ہے۔ اُس کے اشعار میں جام درک کا رنگ جھلکتا ہے۔ اُس کے بعض اشعار ایسے آتے ہیں کہ اُن میں تمیز کرنی مشکل ہو جاتی ہے کہ جام کے اشعار ہیں یا خانے بزدار کی گوہر افشانیاں۔ مثلاً اپنی محبوبہ کی ثنا میں خانے بزدار ایک جگہ کہتا ہے :-

صفتاں چی کناں بے لیکھو یگ ءَ
زری نوداں پہ تیت دیما ترتیگ ءَ
دنتاں لال شیشائی بلان ءَ
گروکی جہبرے پٹے دھیان ءَ

گُل ءِ رنگان دو مِیں اَپریشمانی
دَپ ءِ زرپھُلّ و موتیاں چھڑینان
سپیتّیں شیر و لال بے قیمتیّان
چنار یں قتہ، حسیں جمّاں دو ئیّنان
دَہ بیں مور دا نگُشت دستاں گلینان
چُمبُو و چوٹ ءِ زرتی زرینان
شرءِ گیوار و جھَڈاں زامُرینان۔

پدا ملتے جنے چو شیں نہیاری،
نہ میچینیت گوُران ہچو پھُلبہاری
نہ بندیت چوٹے پھُل و کناری۔

یعنی

مَیں اُس بمپتیاں حسینہ کی کیا تعریف کروں
وہ سمندر سے اُٹھنے والے بادلوں سے بھی بہتر ہے۔
اُس کا چہرہ آئینے کی طرح روشن ہے
میرے خیال میں وہ
اُس بجلی کی طرح ہے جو
برسنے والے بادلوں میں چمکتی ہے۔
وہ ایک پھُول ہے
جس کے ہونٹ ریشم کے ہیں۔
اُس کے مُنہ سے زرِ گل اور موتی برستے ہیں۔
اُس کے دانت دُودھ کی طرح سفید

Scanned with CamScanner

اور موتی کی طرح گراں قیمت ہیں۔
اُس کا قد چنار جیسا
اور آنکھیں بیحد حسین ہیں۔
اُس کے ہاتھوں کی دسوں اُنگلیاں
شاخِ گل کیطرح خوبصورت ہیں۔
اُس کی طلائی بالیاں اور زُلفیں
اُس کی مانگ
اور زامُرؔ کی بیل جیسے گھنے گیسُو
بہت ہی دلکش ہیں۔
پھر کبھی کوئی ماں
ایسی بیٹی نہیں جنے گی۔
نہ ایک ایسی پھُول جیسی بچی کو
اپنے پستانوں سے دُودھ پلائے گی
اور نہ ہی ایسی خوبصورت چوٹیوں کو
گھوندکر اُن میں پھُول لگائے گی
اور سر پہ زرکنار دوپٹہ پہنائے گی۔

خانے بُزدار اپنی اسی نظم میں آگے جا کر اپنی محبُوبہ کی تعریف میں جو اَبیات کہتا ہے وہ بلاشبہ بلوچی شاعری میں بے نظیر تسلیم کئے جائیں گے۔ کہتا ہے:-

سوا ہیں لال، گوں کھُلّ ءِ دری ءَ

ٹ زامُر ایک گھنی بیل جو چٹانوں پر سے نیچے کو لٹکتی اور پھیلتی ہے۔

گوں تئے میچینگی سیتیل پہ پی ءَ
عقل حیراں کہ دُرِ چَموں جُڑتہ
حریفیں پریشنگاں تراشتہ گڑھتہ
تئی سحوراں منی بالاد وَھُڑتہ ۔

یعنی
وہ لعلِ بے مثال ،
اپنے خیمے کے دروازے میں کھڑی
ایسی لگتی ہے
جیسے سیلانی پریوں نے اُسے
اپنا دُودھ پلا کر بڑا کیا ہو ۔
میری عقل دنگ ہے کہ
یہ موتی بنا کیسے ہے ۔
شاید بزرگ فرشتوں نے خود بیٹھ کر
اُسے بنایا اور تراشا ہے ۔
اے حسینہ !
تیرے بے پناہ حُسن نے مجھے
تیرے قدموں میں جھکا دیا ہے ۔

دینار عبداللہ خان نے بھی بعض عشقیہ نظمیں بہت اچھی کہی ہیں

جگہ اپنی محبوبہ کی تعریف میں کہتا ہے :ـ
کہ روچے گوں گہاراں پروّت ملگھزار
زمین بوءَ زوریت پہ مشک و تتار

یعنی
اگر کبھی میری محبُوبہ
اپنی سہیلیوں کے ساتھ
مرغزار کی سیر کو جائے
تو زمین
مُشکِ تتار کی خوشبو سے مہک اُٹھے گی۔

دینار عبدالکریم اپنی محبُوبہ کی ستائش میں اگرچہ بہت تیز ہے لیکن اندازِ بیان عامیانہ اور اُس دَور کے شاعروں کی عام روِش کے مطابق ہے۔ کہتا ہے: ـ

ہردو کیں عینی رو گنت چو استار
یا، گو تتے آسی شہم گنت بازار
جاد دہی ملھے، دِلبرءِ دیدار
گوہرءَ ایر گنت برگیوارءَ
عطر و عنبیر و میلب دھاتار۔
دم دمءَ دھنزیت پہ وُتی جانءَ
شہم گنت دُور چو ماہِ تابانءَ
من زہیر تیّں پہ گمان میانءَ۔

یعنی
اُس کی آنکھیں
ستارے کی طرح روشن ہیں۔
یا یُوں کہو کہ
آگ کی روشنی سے اُس کا چہرہ دَمک رہا ہے۔

دلبر کو دیکھنا ہو تو
چودھویں کے چاند کو دیکھو۔
وہ اپنی مانگ موتیوں سے بھرتی ہے
اور اپنے بدن پہ
عبیر، مہلبؔ[1] اور عطریات ملتی ہے۔
دُور سے وہ ماہِ تاباں لگتی ہے۔
مَیں اُس کمان بیان کے عشق میں
تڑپ رہا ہُوں۔

ایک اور نظم میں دینارِ عبدالکریم اپنی محبوبہ کو صبح کا ستارہ اور حُسن و جمال کو پرتو نور کہتا ہے لیکن اِس کے باوجود، نظم میں وہ سنگینی نہیں جو جام دُرک دُوسرے بلند پایہ بلوچی شعراء کے ہاں ملتی ہے۔ دینارِ عبدالکریم کہتا ہے :-

زباد ہار ود کنت گیوار
چراگھ ءِ شہم کنت دربار
گُل ءِ دیم و گُل ءِ رُخسار
گُل ءِ قتہ و گُل ءِ دیدار
گُل ءِ شر عادت و کردار
عجب جوڑ کتگنت سُتار
چو بام ءِ روشنیں استار
وخی رکھشیت چہ انوار۔

---

[1] اسی نام کے درخت کا خوشبودار پھل جسے پیس کر استعمال کیا جاتا ہے۔ ا۔م

یعنی

میری محبوبہ جب اپنی مانگ کو
زبادے معطر کرتی ہے
تو اُس کا چہرہ چراغ کی طرح روشن ہوتا ہے۔
اُس کا چہرہ، اُس کے رُخسار
اُس کا قد و قامت اور اُس کا حُسن
اُس کی اچھی عادتیں اور اُس کے کردار کو
خُدا نے خود ایسا اچھا بنایا ہے۔
صبح کے روشن ستارے کی طرح
اُس کے چہرے سے نُور برستا ہے۔

بلوچستان کے خان، میر عبداللہ خان احمد زئی، فنِ سپاہگری و حکمرانی کے ساتھ ساتھ فنِ شاعری میں بھی یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ بڑے بانکے اور عاشق مزاج شخص تھے۔ ایک دفعہ جبکہ وہ اپنی خانہ بدوش محبوبہ سے ملنے گئے تھے کہ چمکتی ہوئی بجلیوں اور گرجتے ہوئے بادلوں نے محبوبہ کے خیمے میں اُن کو گھیر لیا۔ مینہ کی جھڑیاں لگ گئیں۔ خیمہ ٹپکنے لگا۔ خان اور اُن کی محبوبہ بھیگ گئے۔ اِس وقت اُن کی رگِ شاعری پھڑک اُٹھی، اشعار کی آمد شروع ہوئی اور ایک ایسی بے نظیر نظم عالمِ وجود میں آئی جسے عوام و خواص ابتک فراموش نہیں کر سکے ہیں۔ نظم ایسی ہے کہ سُن کر اُس رات کی کیفیت مجسّم بن کر سامنے آ جاتی ہے۔ خان عبداللہ خان کہتا ہے:

دوشی گرِ دکان تاں سے پڑی جو ہاری جنگ
حکم ستارہ ءُ ایک شپ ءُ چار گُنڈ گولنگ
گُھل اُتّی ءِ من ورا ئی بشزاں ریچتگ
تراپ کنیں تیرِ نیان ءِ گُل ءِ دیم ءُ ترُو ہتگ

دوستوں گوں کِرمانی کناویزاں تَرّ کتگ۔

ہار خُراسانی، مَن لَیبیں آسکی گردن ءَ

دیمی گوں بنتالی زباد بوہیں چندن ءَ

نوک زدیں دُرّ گوں پُور و درَشوکیں کُنتلان

آ، طلاریجیں باَمینگ گوں سیمی سنگہان

کُرشیں سر دستان گوں نگارِیجیں تَملان۔

یعنی

شبِ گذشتہ بجلیاں

تین دفعہ ناچیں اور کوندتی رہیں۔

اور خُدا کے حکم سے

ایک ہی رات میں وہ چاروں طرف گھوم گئیں۔

بارش نے، درّتی کے سبزہ زار میں

میری محبُوبہ کے خیمے کو تربتر کر دیا۔

جھلکتی، ٹپکتی بُوندیں

میری محبُوبہ کے چہرے پر بھی پڑتی رہیں۔

اُس نے کرمانی کناویز[1] کے لباس کے ساتھ

اُس کے بدن کو بھی بھگو دیا۔

اُس کی ہرنی کی سی گردن میں پڑے ہُوئے

خُراسانی ہار کو،

زباد[2] اور ہندوستان کی خوشبُودار چندن مَلے ہُوئے

---

[1] ایک ریشمی کپڑا　　[2] ایک خوشبودار کریم

اُس کے حَسین چہرے کو
اُس کی کانوں کی نئی بنائی ہُوئی بالیوں کو
اُس کے آویزوں اور تابدار زلفوں کو
اُس کی طلائی چُوڑیوں
اور سی کے بنائے ہُوئے کنگنوں کو
اور اُس کے ہاتھی دانت جیسے سفید بازوؤں
اور اُن میں پڑے ہُوئے نگار ہیچ ٹلملوں[1] کو
برسات کی جھڑیوں نے تر کر دیا۔

حُجام درگ، نے نسیم سحر کو بہشتی اس لئے کہا ہے کہ وہ رات اُس کی محبُوبہ کے چہرے سے پھیل کر اور اُس کی خوشبو اُڑا کر لاتی ہے لیکن خان عبد اللہ خان نسیم سحر سے کہتے ہیں ؎

تُر بہشتی یے اُو زرہ و دشں گھو شیں سیمین
من گُل ؛ دیم ؛ ترُو ہنتے بے گنجیں زہیم۔

یعنی

اے سمندر کی، لپک کر چلنے والی نسیم
بلا شُبہ تم بہشتی ہو،
کہ تم میری محبُوبہ کے چہرے پر
اپنے گراں بہا موتی نچھاور کر آتی ہو۔

محبُوبہ کا تصوّر خان عبد اللہ خان کے ذہن پر چھایا ہُوا رہتا ہے۔ ایک رات جب اُسے خواب میں دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں :؎

---

[1] سونے چاندی کے بنے ہوئے منکوں کا ایک زیور جسے عورتیں ہاتھوں میں پہنتی ہیں۔ ا ح

دوشی مں واب ءُ دُرّ ابا بتّیں دوست وُتی
دیستہ یاقُوت و دانگی دُرّ ءِ قیمتی
اَچ تئی خیالاں ، غافل نہ اَنت مںی بالاد تہتکی۔

یعنی

رات میں نے

اپنی دُرصفت محبُوبہ کو

اُس یاقُوت اور گراں قیمت موتی کے دانے کو

خواب میں دیکھا۔

اے میری محبُوبہ !

تیری یادوں سے میری قامتِ رعنا

کبھی غافل نہیں رہ سکتی۔

خانؔ عبداللہ خان کی محبوبہ پلاشُبہ ہزاروں میں ایک ہوگی اور جب

وہ سنگار کر کے نکلتی ہوگی تو برق گراتی چلی جاتی ہوگی چنانچہ ، میر عبداللہ خان خود کہتے ہیں کہ

ہر دیں مہگونگ کہ دپ و لُنٹانی رجنت
سیرو ہاردسی و عیدی ردپے سُنبہیت
داگہ مںی موجانی دِل ءُ بندو کاں دَرچیت
چہ کمان تیراں ءُ مں ءُ گیتے جنت گُشتے
بیاات اُو مرداں ! اگہ مں ءُ بے اَجل مہرنگ گُشیت۔

یعنی

جب کبھی وہ مہوش

اپنے ہونٹوں کو سُرخ رنگ دیتی ہے

کسی شادی یا کسی اور خوشی کے موقع پر

یا عید کے دن

جب وہ سنگار کرتی ہے

تو میرے موجی دل پہ داغ دیتی ہے۔

اور اپنے کمانِ ابرو کے تیروں میں سے

ایک ترچھا تیر مجھے مارتی ہے۔

اے لوگو، آؤ!

کہ وہ مہوش مجھے بے اجل مار ڈالتی ہے۔

خان عبداللہ خان کو اگرچہ اپنی محبوبہ کے حُسن و وفا پہ ناز ہے لیکن ساتھ ہی اُسے یہ خطرہ بھی لگا رہتا ہے کہ کہیں اُس کا کوئی رقیب اُس کی محبوبہ پر جادو کر کے اُس کا دل نہ پھیر دے۔ بلوچی شعراء میں یہ خیال صرف عبداللہ خان کے ہاں ملتا ہے غالباً اس لئے کہ اُن کو درباری سازشوں اور گنڈے تعویذوں سے زیادہ واسطہ پڑا ہوگا۔ اُس کی طبیعت اس لئے زیادہ حساس ہے اور وہ اپنی محبوبہ کو بھی اس کا احساس دلانا چاہتے ہیں کہ محتاط رہے چنانچہ کہتے ہیں:-

خیمرہ لُڈو کیں پری مِنّت اِنت ترا

ھم جن وھیر پُرکن اَچ کپینکیّن مردُمان

ناگہان نہ سرجالیں مرتُمے آھو کنت ترا

جن دجادیگ وھترگی ھیزکنت تئی دلءَ

نیوگا وشیں ترنج من وتکل بنت مس دپءَ۔

یعنی

اے خیمے کی سُبک خرام پری!

میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ

عیاروں سے نظر بچاؤ اور پرہیز کرو

(کہیں ایسا نہ ہو کہ) کوئی دیوانہ تیرے پیچھے پڑ جائے

اور جنات، جادو اور بوڑھی حرّافوں کے ذریعے

تیرا دل مجھ سے پھیر دے۔

(خدانخواستہ اگر ایسا ہُوا)

تو، میووں میں میٹھا ترنج بھی

میرے مُنہ میں تلخ ہو جائے گا۔

خان عبداللہ خان ایک مانے ہوئے شکاری بھی تھے، اُن کا کردار بعض صورتوں میں مشہور بلوچ ہیرو حمل جیئند سے ملتا جُلتا ہے۔ بلوچستان کے طُول و عرض میں پہاڑوں پر جہاں جہاں پہاڑی بکروں کا شکار ملتا، میر عبداللہ خان وہاں شکار کھیلنے کو جایا کرتے تھے۔ بعض اونچے اونچے دشوار گذار چٹانوں پر پتھروں کے ڈھیر یا چیدگ کی صورت میں اُس کی یادگاریں اب بھی ملتی ہیں۔ اپنی اِس شکاری ہونے کی مناسبت سے میر عبداللہ خان اپنی محبُوبہ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں: ؎

نہیگہ آسان اِنت ماھمی ھکمانی گُذار

پُشتت کپّل، پر وشین ماہلیں گورانی کنار

بیک تئی گر ذنت شنگیں لہری، سی ھزار

شرّے بیجیؒ، تچگے چو کوہانی نھر ءَ

لیلی ءِ پاکیں گردگ چو آہُو مس تل ءَ

علیہت مان نیستن، من کجام علیا نہت دیان

؎ بلوچی میں ترجی کو کہتے ہیں۔

دُرنجادے یِے، مَن گُجام وصفا نہت کنان۔

یعنی
جیسا کہ حُکم اور حاکمی سے دستبردار ہونا
آسان نہیں۔
جیسا کہ پہاڑی بکروں اور دُنبوں کی پیٹھ کے
لذیذ گوشت کھانے سے پرہیز کرنا
میرے لئے مشکل ہے۔
اُسی طرح، اے محبوبہ!
تم سے دستبردار ہونا بھی میرے لئے آسان نہیں۔
تم اِس قدر حسین ہو کہ
تمہارے ڈھلے ہوئے گھونگریالے گیسو
تیس ہزار لہری بندوقوں سے بھی زیادہ
مجھے پیارے ہیں۔
تم بہت اچھی ہو۔
تم راس اکجبل کیطرح سیدھی ہو۔
اَے میری لیلیٰ!
تیرا خرام ناز ایسا ہے
جیسے وادی میں کوئی ہرنی اٹھلاتی پھرتی ہو۔
تم میں جب کوئی عیب ہی نہیں
تو میں تم کو کیا عیب دُوں
تُم دُرنژاد اور سراپا حُسن ہو۔

مَیں تمہاری اور کیا تعریف کروں۔

بلوچی کے اکثر شاعروں نے محبوبہ کے گیسوؤں کو کالے ناگ اور گردن کو

تشبیہہ دی ہے۔ ایک نامعلوم شاعر کہتا ہے :ـ

جنک کبگے کہ لڈیت من بہارا
من ءَ گندیت وچیر دنت وَت ءَ را
بلنز یںبیں گردن ءَ کشیت چو مار ءَ۔

یعنی

وہ لڑکی ایک چکور ہے
جو سبزہ زار میں خراماں پھرتی ہے
مجھے دیکھ کر چھپ جاتی ہے
لیکن، اپنی لمبی گردن سانپ کی طرح
اُوپر اُٹھا کر مجھے دیکھتی بھی ہے۔

بلوچی کی عشقیہ شاعری میں لوک گیت بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ بڑے
ہمہ گیر اور بھرپور ہوتے ہیں۔ بلوچی شاعری میں ہر موضوع پر ایسے حسین و دلکش لوک گیت
ہیں کہ سُن کر طبیعت کھِل اُٹھتی ہے۔ بعض لوک گیت منفرد اور بعض دوگانوں کی صورت میں
جن کو دو آدمی مل کر گاتے ہیں۔ ڈیہی، مورو، لیلی مور، زہیروک اور لیکو وغیرہ لوک گیتوں
میں آتے ہیں۔ ایک عشقیہ لوک گیت کے کچھ بیت ملاحظہ ہوں، عاشق اپنی معشو
کہتا ہے :ـ

سرتی بیلوی سیاہ مارے پدا
جیگھ تتی حاکمی چھلیے من گوتر ءَ
دنتان شیشگ ءِ چندرنت من ذپ ءَ

پُتی، پیچ گیرت رکانی سرء

چو کہ شیپر اگھڑتی نیم شپء

ڈیھ و ڈھلکوان بیتہ تی سُتا

جُز گوں ہمسران، زرمی و بیا

یعنی

تیرے سَر کے پیچھے

بیلے کے سیاہ ہار (لٹک رہے) ہیں۔

تیرے گریبان پر

حاکمانہ کشیدہ کاری کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔

تیرے مُنہ میں دانت ایسے لگتے ہیں

جیسے کسی چکّی کے دندانے شیشے کے ہوں۔

تیری مُنقط ہونٹوں پر

اس طرح تھرتھراتی ہے، جیسے جگنو

آدھی رات کو پھرتا ہو۔

راوت خان جلبنانی کی زبان سادہ اور سلیس ہے وہ روزمرہ کے مطابق بات کہتا ہے جو اُس کے دل میں ہوتی ہے اُس میں بناوٹ نہیں ہوتی اس لیے اثر انگیز ہے۔ اپنی ایک نظم میں اُس نے اپنی محبوبہ کو بادشاہ کہہ کر، ایک لفظ میں اُس کی وہ صفات یعنی شان و شوکت، غرور و تمکنت، جود و سخا، بے نیازی و بے پرواہی اور عفو و درگزر جو ایک بادشاہ میں ہو سکتی ہیں گنوا دی ہیں۔ کہتا ہے:

اُلّ اِنت بادشاہ، ما اَں سوالی

بقین زانوں، نہ گردوں تو رک وحالی۔

یعنی

اصل بادشاہ ہے

اور ہم سوالی بن کر (اُس کے دربار میں) آتے ہیں

اور ہمیں یقین ہے کہ

خالی ہاتھ واپس نہیں جائیں گے۔

راوت خان جلنبانی کہتا ہے کہ محبوبہ کا یہ سمجھنا کہ صرف اُس کی باتوں سے عاشق مطمئن ہو جاتا ہے غلط ہے۔ وہ خود تو قتل کرتی ہے اُس کی انگلیاں عاشقوں کے خون سے سُرخ رہتی ہیں لیکن عاشق کو صرف باتوں باتوں میں بہلانا چاہتی ہے۔ مدعا یہ کہ جام پیئے بغیر عاشق کو اطمینانِ قلب حاصل نہیں ہوتا۔ کہتا ہے :-

ہے گالاں نہ گوشتہ من پتی ہیر

توار ءَ عاشقانی لاپ نبت سیر

دَحین مور دانگاں ہنتی کنت لال

من ءَ زُ سِنت کہ گوں مُرگھاں کنت بال۔

یعنی

یہ باتیں میں نے نہیں کہی ہیں۔

یہ کسی اور کا بیان ہے کہ

محبوبہ کی صرف آواز سُن کر

عاشقوں کو تسکینِ قلب حاصل ہو جاتی ہے۔

میری محبوبہ جب اپنی دسوں انگلیوں کو

مہندی لگا کر سُرخ کر دیتی ہے

تو مجھے ڈر لگتا ہے

Scanned with CamScanner

کہ کہیں وہ پرندوں کے ساتھ اُڑ کر نہ جائے۔

• نوجوانی ہی ناز و ادائیں دکھلانے کی عمر ہوتی ہے۔ اِس لئے راوت خان اپنی محبوبہ سے کہتا ہے: ؎

کمر یکمشت و جان اَبریشمی اِنت
بکن داب کہ ہمی داب ءِ وہی اِنت۔

یعنی

تیری کمر مُٹھی بھر کی
اور تیرا بدن ریشم کا ہے
اے محبوبہ! ناز و ادائیں دکھلا
کہ یہی ادائیں دکھلانے کی عمر ہے۔

مُلا نُور محمد بمپشتی اگرچہ الفاظ کی چُست بندش اور رنگین بیانی میں مہارت رکھتا ہے لیکن طوالتِ گفتار سے معانی کو اُلجھا دیتا ہے۔ مثال کے طور پر اپنی محبوبہ کی خُوبیاں بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: ؎

کمانِ میانین کمان اَبرُو
مُعَطّر وارِ دین گُل بُو
جمالِ تابندگیں بانُو
حنا انگُشت و زر بازُو
مرامی کرد در آزُو[1]
نظر انداختہ ہر سُو

---

[1] آز سے ہے، یعنی حرص، لالچ اور یہاں آرزو ہے۔ ا۔م

بنیم ناگہاں ماھرد۔

یعنی

اپنی کمان میان و کمان ابرو محبوبہ،

پھولوں کی خوشبو کے منبع کو،

اُس بندہ جمال بانو کو،

اُس مہندی رچی اُنگلیوں والی کو

اور سعید بانہوں والی حسینہ کو،

میں جس کی آرزو میں تڑپ رہا ہوں

دیکھنے کے لیئے

میں نے ہر طرف نظر دوڑائی

کہ شاید، اتفاق سے کہیں نظر آتے،

(مگر افسوس مجھے وہ کہیں نہیں ملی)

ملا نور محمد بمپشتی اپنی ایک اور نظم میں اپنی محبوبہ کی سہیلیوں کے ساتھ پہاڑی ندی کی طرف جانے کی تیاریوں کا ایک خوبصورت اور دل نشین انداز میں بیان کرتا ہے۔ کہتا ہے

اُمل گوں عنبر و عطران

جم کنت دسگہار کاں

خمار چمیں تنگ رکاں

دتی خاصیں کنیزکاں

بزیرنت کدہ و شکاں

گل ءِ شار دُشکگاں

روں نت داں دیر سرین لکاں۔

یعنی

اُٹھ! عطر و عنبر سے معطّر ہو کر
اپنی خماری آنکھوں اور پتلے ہونٹوں والی
سہیلیوں کو جمع کرتی ہے۔
اپنی خاص کنیزوں کو بھی ساتھ لیتی ہے
جو خوشبوؤں کی کٹوریاں
کنگھی اور آئینہ
اور ریشم کا ریشمی لباس اور سنگار دان اُٹھا کر
اُس کے ساتھ
دُور ندی کے ذخیرۂ آب پہ جاتی ہیں۔

بھرام جکرانی، بلوچی کا ایک نغز گو شاعر گذرا ہے وہ عوام کی زبان میں شعر کہتا رہا ہے۔ اپنی ایک نظم میں بھرام نے اپنی محبوبہ کے بند بند کی تعریف میں جو سماں باندھا ہے وہ رنگ و روپ کا ایک حسین امتزاج ہے جس کی نظیر بلوچی شاعری میں بہت کم ملتی ہے۔

کہتا ہے :۔

جی ترا، بہر لوڑ کہیبانی
سونہ وسہ تاج ہمسر وآنی
بارگین میان ولوڈ، زیبانی
کدہ تہیں چم دگر یدہ سروانی۔
جی، تئی کمتیغی زیدہ گیں چمّان
جی، تئی دُولان دگو تریو درتان
جی ترا بات کہ صدجیاں کرتے

شپگر دی امن ا زمگاں لرزے۔

یعنی کہ

جی تم کو ، اے میری فخر و نازوں والی محبوبہ !

بیشک تم

اپنی ہم عمر حسیناؤں کی سرتاج ہو۔

تیری پتلی کمر ،

تیرا خرام ناز

تیری کٹوروں جیسی آنکھیں

اور تیری ہرنی کی سی گردن اُن میں بچھاں !

جی ، تیری پُرکیف اور حُجی مائل آنکھوں کو

جی ، تیرے ہاتھوں کو۔

اور جی ، تیرے ہاتھوں میں پڑی ہوئی چوڑیوں کو۔

جی ، تیری گردن کو

اور جی ، تیری گردن میں پڑی ہوئی موتیوں کی لڑی کو۔

جی ، تم کو

کہ تم سو بار جی کہلانے کے لائق ہو۔

اپنے ریشمی نرم لباس میں

تم ، رات کو دُور چمکنے والی بجلی کی طرح ہو۔

مُلّا دادرحمان میری نے بعض نظمیں بڑی اچھی کہی ہیں ، زبان بھی شُستہ اور سلیس ، جیسا کہ اس نظم میں اپنی محبوبہ کی صفت میں کہتا ہے ؎

نشتہ منی دوست مہولین

Scanned with CamScanner

گوں ہمسراں جانی گلّین
ملگھوری رنگ ششنبلین
پیچیت زلفاں کاگلین
چمّی خمار تنت قاتلین
پوشاکی حریر تنت مخملین
رگشتیت چو بدرء کاطلین

یعنی کہ

میری مہوش محبوبہ!
اپنی پیاری گل رنگ اور ہم عمر
سہیلیوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہے۔
اُس نے اپنی سنبل جیسی کاکل کو شانہ کیا ہے،
زلفوں کو بل دے کر
کاکل سے نکالا ہے۔
اُس کی قاتل آنکھیں، مخمور ہیں،
اُس کا لباس حریر و مخمل کا ہے،
جس میں وہ پورے چاند کی طرح چمک رہی ہے۔

خدا بخش بیرداداني مری نے اپنی محبوبہ کی تعریف میں ایک انوکھی بات
ہی ہے۔ وہ کہتا ہے:

درپشکن ہلنغ، چوکہ درہیں گوارو کیں جڑان

۱۔ حریر

زُشتہ ماڑی ءَ، گریہت چو لُشتی گُہکرءَ ۔

یعنی :

میری محلیج اس طرح دمک رہی ہے،

جیسا کہ

بادلوں کے برس جانے کے بعد

فضا میں دھنک درخشاں ہو۔

(مگر آج) وہ ماڑی میں بیٹھی ہوئی

ساون کی گھٹا کی طرح رو رہی ہے۔

توکلی مست نے اپنے تصور کی دنیا میں سمّو کو ہزار رنگوں میں ر

سراہا ہے لیکن اُس کا کوئی رنگ بھی بلوچی ماحول اور معاشرہ سے باہر کا نہیں۔ ہر رنگ میں س

ایک بادیہ نشین بلوچ عورت کے روپ میں نظر آتی ہے۔ اِسی بلوچیت نے توکلی مست

اس دَور کے مُلا شاعروں سے نکھار اور ممتاز کیا ہے۔ ہمارے مُلا شعراء کی محبوبائیں عموماً

میں پلی اور زیورات میں لدی پھندی شہری خواتین امیرزادیاں اور شہزادیاں ہوتی ہیں مگر

مست کو ایک بادیہ نشین بلوچ کیطرح گرجتے بادلوں، کڑکتی بجلیوں اور موسلادھار بارش

اُس کی جھڑیوں سے عشق ہے اِس لیے وہ اپنی محبوبہ سمّو کو بھی اِن ہی مناظر قدرت کا ایک

سمجھتا ہے۔ اپنی ایک نظم میں وہ، سمّو کی تعریف و ستائش میں اور بہت کچھ کہنے کے بعد آخر

یہی کہتا ہے کہ سمّو، ساون کی گھٹاؤں کی کوندتی بجلی ہے۔ ملاحظہ ہو: ے

سمّو ! تئی زہیں جُزنگ وَ دُشیں کھندگان

سمّو ! تئی ڈوک کہ چو ستارءَ وُجّی بانگوان

ہر دو ہیں دست ءِ منگلی، آسیگ ءُ بلان

جیگ کھڑوئی ءَ داشتگنت دُمتانیں گوران

سینگ تعویذ شیگروکی تاڑیاں جنان
مئے دل ءِ جاگینت چو بشامی جڑان
دوست منی وڑتیں کشتی من سشوزیں گہکران
چیلکاں جنت چو ساون ءِ آپ بندیں جڑان۔

یعنی

سمو! تیری سُبک خرامی اور تیری پیاری ہنسی
سمو! تیری آواز
علی الصبح جیسے ستار بج رہا ہو۔
تیرے دونوں ہاتھوں میں پڑے ہوئے منکے
جو، آگ کی طرح روشن ہیں
تیرے دونوں پستان
جو تیر اگریبان چھاتی سے اُوپر اُٹھائے ہوئے ہیں۔
اور، تیرے سینے پہ آویزاں تعویذ
جو، رات کو دُور چمکنے والی بجلی کیطرح
تیری چھاتی پر کوندتے ہیں،
ساون کی گھٹاؤں کیطرح میرے دل کو جگاتے ہیں۔
ایسا لگتا ہے کہ تُم
اے میری موتی جیسی محبُوبہ!
کالی گھٹاؤں میں کھڑی ہو
اور ساون کے پُرآب بادلوں میں
بجلی بن کر کُوندتی ہو۔

بلوچی شاعری میں مُلا فاضل رِند کا اپنا ایک مقام ہے۔ جس کی زبان کبھی تو اتنی سلیس اور فصیح ہے کہ داد دینے کو جی چاہتا ہے لیکن کبھی اتنی فارسی آمیز، عربی طغوبہ اور گنجلک ہے کہ دل بھر جاتا ہے۔ اِس کے باوجود بلوچی کا وہ ایک بہت بڑا شاعر ہے۔ جس کا نہ صرف انداز بیان اور طرزِ گفتار تابدار ہے بلکہ پروازِ خیال بھی گردوں سیر ہے۔ اِس لئے اُس کے کُنہ سخن کو پانا بہت مشکل ہے۔ ٹھیٹھ بلوچی میں بھی وہ مشکل گو واقع ہوا ہے۔ مثال کے طور پر جب وہ شاعرانہ ترنگ میں آکر اپنی محبوبہ کی تعریف کرتا ہے تو اُس کی زبان سے ایسے نادر الفاظ کے موتی بکھر گئے ہیں، جو پہلے شاید کسی بلوچ نے سُنے ہوں۔ کہتا ہے ؂

ہر وَھد داب کنت نودی شُل
گندیم گونگیں گرگی تل
اِستنین ءِ پیبافین ترزنگل ۔
دُرتین ہتلی ہیم ساقین
ماثے دہ پہار بے باکین
درشپوکیں تہیل جب اکین ۔
شپ مں آخرء لنج ءُ بیت
پُر نوریں سحر گنج ءُ بیت ۔

یعنی ؂

لکہ ابر کی مانند جھوم کر چلنے والی
وہ گندم گوں محبوبہ!
کھجور کے نئے پھوٹنے والے شگوفے کی مانند
مانند برف سفید اور نرم و نازک صورت والی
برق افشاں بادلوں سے برسے ہوئے

Scanned with CamScanner

اُولوں کی طرح لطیف و نفیس ہے۔
وہ سفید پنڈلیوں والی، دُرِ صفت محبوبہ
چودھویں کے چاند کی طرح منوّر
اور سُہیل کے چمکدار ستارے کی طرح جابر[1] ہے۔
وہ اندھیری رات کے
آخری پہر کے بعد دمکنے والے
سپیدۂ سحر کی مانند ہے۔

ایک اور تعریفی پاستانی نظم میں مُلّا فاضل اپنی محبوبہ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

مِثلِ مجنوناں، لال! تو ئے لیلی
دل مِنی سہر ریچینت گُماں کیلی
کدہ ہیں چشم و چو توان تیلی
قدّ و بالاد و صورتی ستیلی
ہر چی ہے سودائے ترا نہیلی
زِندگیں روچانی خُدا مھیلی۔

یعنی:

اَے محبوبہ! اَے لال!
مَیں مجنوں اور تم لیلیٰ ہو۔
میرے دِل کا پیمانہ، غموں سے لبریز ہو چکا ہے،
تیری کٹوروں جیسی آنکھوں،

---

[1] مشہور ہے کہ سہیل کا ستارہ جابر ہوتا ہے، جس کی شعاعوں سے حشرات الارض مر جاتے ہیں۔ اعجم

تیرے نیل آلودہ گیسوؤں ،
تیری قد و قامتِ زیبا ،
اور تیری حسین صورت کا
میں پرستار ہوں ۔
جو شخص بھی ہمارے ملاپ کی راہ میں
رکاوٹ ہو ،
خدا اُسے
زندگی کے دن پورے کرنے نہ دے ۔

دوسری زبانوں سے متعلق ہم نہیں کہہ سکتے لیکن، جہاں تک بلوچی کا تعلق ہے اُس کے قدیم و جدید شعرا کے کلام کا موازنہ کرنے سے اِس امر میں شک کی گنجائش نہیں رہتی کہ مُلّا، عُلما اور بلوچی کے دوسرے پڑھے لکھے شاعر اپنے اشعار سے بلوچ کی رُوح کو اُس طرح متاثر کرنے میں ناکام رہے ہیں جس طرح کہ ایک سیدھا سادہ اُمّی شاعر اُس سے بغل گیر ہُوا ہے۔ غالباً، ایسا محض اِس لئے ہُوا ہے اور ہو رہا ہے کہ مُلّا اور لکھے پڑھے شاعر بلوچ کے فطری جذبات کے تار کو چھیڑنے کی بجائے لفاظی کا سہارا زیادہ لیتے رہے ہیں اور ایسی باتیں کہتے ہیں جن سے بلوچ اب تک آشنا نہیں ہُوا ہے لیکن اُمّی بلوچ شاعر جو اُسی ماحول میں گذر بسر کر رہا ہے جس میں اُس کے سامعین رہ رہے ہیں اِس لئے وہ وہی باتیں کرتا ہے اور اُسی انداز اور پیرائے میں کرتا ہے جو آسانی سے سامع کی سمجھ میں آ سکتی ہیں اور اُس کے جذبات کو اُبھار سکتی ہیں۔ اُس کے پاس جذبات کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا البتہ اُس کی زبان میں فطری سلاست اور چاشنی ہوتی ہے جس کے لئے اُسے راہ سے ہٹ کر دماغ سوزی نہیں کرنی پڑتی۔ جو بات دل میں آتی ہے اُسی طرح بلا تکلف زبان سے نکلتی ہے اِس لئے مؤثر ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر نذر حسن کیچی کی نظم دیکھئے۔ کس سادگی مگر پُرکاری سے اپنی خو

تعارف کراتا ہے :-

زُیبا ، سروِ ، رستگیں بالادءِ بچار !
چو نہ اِنت مُرچی : چاردہءِ ماہءِ بیت گُہار
سیلے تچتیں ، برکھوارت تیگہ آبدار ۔
گوات سراں ہونگتیں ، سمیں گشیت پہ مدار
لُڈِّنت پہ نازی سرشماں ، ہنبوئیں بہار
اُو واجہ ! حالتاں وتو پہ متے دستورءِ بچار
پمنی چماں جھلقا ، اوصافاں دُرِنت
چار دہی ماہءِ مُتّنت وبامءِ اُخترِنت ۔
یعنی

(دوستو !)

تُم آکر ذرا اِس سروِ کا قدِ بالا تو دیکھو !
آج اُس پر کیا نکھار ہے
بالکل چودھویں کے چاند کی بہن لگتی ہے ۔
اور ، سان چڑھی تیغِ آبدار کی طرح درخشندہ ہے ،
اُس کا خرامِ ناز تو دیکھو
جیسا کہ موسمِ بہار کی ایک ٹھنڈی صبح کو
نسیمِ سحر
گھاٹیوں میں اُگے ہوئے سبز گھاس کو
ایک ادائے ناز سے لہراتی ہو ۔
اَے میرے آقا !

تم اُس خاتون کو میری نظروں سے دیکھو

تو وہ مطلق تعریف کی حدود سے باہر نظر آئے گی

میری نظر میں

وہ چودھویں کے چاند کی ہم پلہ ہے

یا صبح کا روشن ستارا ہے۔

نوٹنکے کے فقیر شیر جان اپنی محبوبہ کی ستائش میں اگرچہ چند سیدھے سادے اور عام اشعار کہتا ہے لیکن اُن میں جو رنگینی، تابندگی اور بر ندگی ہے اُس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ موسم بہار میں جب دختران صحرا بن سنور کر، ٹولی ٹولیوں میں سیر کے لئے گھروں سے نکلتی ہیں۔ گاتی دف بجاتی سبزہ زاروں میں اٹھلاتی پھرتی ہیں تو شاعر کیا، زاہدان گوشہ نشین پر بھی اُن کو دیکھ کر ایک وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ فقیر شیر جان اس پس منظر میں اپنی محبوبہ کو دیکھتا ہے اور بے اختیار کہتا ہے :-

مہنگُل ءِ چارچی من جہان ءَ پیدا اِنت

چم مہنگُل ءِ تیر اِنت، بُرو دانی شلیتین خنجر اِنت

زلفی چو شیرازی طلاکودیں زرِ ہبر اِنت

دپ و دنتانی، لال و یاقوت و گوہر اِنت۔

در کپنت دختر ستیل ءَ پہ نیمونے بہار

ہمتیش گند اِنت، یہ آوان گُشیت دگہار

گوں دت ءَ خلوت کنت دیخیچ و نشار

من گمارت نزاں ہمے باگھانی چنار۔

مہنگُل ءَ دوستیں کیرے نوشکو ءِ کنار

عرض منی ایشں انت ہمنشین طوطی گوش بدار

دُشمن پہ ترس نہ کرے اشن من نو فرا ۔

یعنی

ماہ گُل کی چار چیزیں جہاں میں مشہور ہیں ۔

اُس کی آنکھیں تیر

اور اَبرو نوکیلے خنجر ہیں ۔

اُس کی زُلفیں

فولادی زرہوں کو کاٹنے والی

زرمُشت شیرازی تلوار کی طرح ہیں ۔

اُس کا دہن لعل و یاقوت

اور اُس کے دانت گوہر جیسے ہیں ۔

بہار کی سیر کرنے کے بہانے

لڑکیاں جب اپنے گھروں سے نکلتی ہیں

اُس وقت، ہمجولیاں جب مہ گُل کو دیکھتی ہیں

تو اُن کے پاؤں تلے سے

زمین سرک جاتی ہے ۔

جیٹھانیاں، دیورانیاں اور نندیں

ایک دُوسرے سے چپکے سے پوچھتی ہیں :

"باغوں کا یہ چنار پیدا کہاں ہوتی ہے"

دوستو !

میں نے ایک دفعہ

اُسے (جُوسے[1]) تو ننگے کے کنارے دیکھا ۔

---

[1] وہ جگہ جہاں گاؤں کی عورتیں پانی بھرنے کو جاتی ہیں ۔ الخ

تم اُس خاتون کو میری نظروں سے دیکھو
تو وہ مطلقاً تعریف کی حدود سے باہر نظر آ ئیگی
میری نظر میں
وہ چودھویں کے چاند کی ہم پلہ ہے
یا صبح کا روشن ستارا ہے۔

نوشکے کے فقیر شیر جان اپنی محبوبہ کی ستائش میں اگرچہ چند سیدھے سادے اور عام اشعار کہتا ہے لیکن اُن میں جو رنگینی، تابندگی اور بر جستگی ہے اُس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ موسم بہار میں جب دختران صحرا بن سنور کر، ٹولی ٹولیوں میں سیر کے لئے گھروں سے نکلتی ہیں۔ گاتی دف بجاتی سبزہ زاروں میں اٹھلاتی پھرتی ہیں تو شاعر کیا، زاہدانِ گوشہ نشین پر بھی اُن کو دیکھ کر ایک وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ فقیر شیر جان اِس پس منظر میں اپنی محبوبہ کو دیکھتا ہے اور بے اختیار کہتا ہے:۔

مہ گُل ءِ چار چی من جہان ءَ پیدا اوں تنت
چَم گُل ءِ تیر تنت، بُرواں شلیّن خنجر تنت
زُلفی چو شیرازی طِلا کودیں زرِ جوہر تنت
دَپ و دنتانی، لال و یاقوت و گوہر تنت۔
در کپنت دختر ستیل ءَ پہ نیمونے بہار
ہمتبش گند تنت، پہ آدان گُٹیت ڈگار
گوں وَت ءَ خلوت کنت ءِ دَچیچ و نشار
من گُماں ءُ ستہ اے ہمے ہا گمانی چنار۔
مہ گُل ءُ دوستیں کیبرے نوشکو بوکنار
عرض مئی انت ہمتیں طوطی گوش پدار !

دُشمن و تُرس و شرمے اش کن تو فرار ۔

یعنی

ماہ گُل کی چار چیزیں جہان میں مشہور ہیں ۔

اُس کی آنکھیں تیر

اور ابرو نوکیلے خنجر ہیں ۔

اُس کی زُلفیں

فولادی زرہوں کو کاٹنے والی

زرمُشت شیرازی تلوار کی طرح ہیں ۔

اُس کا دہن لعل و یاقُوت

اور اُس کے دانت گوہر جیسے ہیں ۔

بہار کی سیر کرنے کے بہانے

لڑکیاں جب اپنے گھروں سے نکلتی ہیں

اُس وقت ، ہمجولیاں جب ماہ گُل کو دیکھتی ہیں

تو اُن کے پاؤں تلے سے

زمین سَرک جاتی ہے ۔

جیٹھانیاں ، دیورانیاں اور نندیں

ایک دُوسرے سے چپکے سے پوچھتی ہیں :

"گاؤں کا یہ چنار پیدا کہاں ہوتی ہے"

دوستو !

میں نے ایک دفعہ

اُسے (جوتے ؎) ترشنگے کے کنارے دیکھا ۔

؎ جہاں گاؤں کی عورتیں پانی بھرنے کو جاتی ہیں ۔ الخ

اور اُس سے عرض کیا

کہ اے میری ہمنفس طوطی !

میری یہ گذارش سُن لے اور اُس پر غور کر

دشمنوں کے کہنے میں آ کر

یا اُن سے ڈر کر

مجھ سے قطع تعلق نہ کر لینا۔

فیض محمد لاشاری المتخلص بہ فیضل فقیر نہ صرف ایک خوش بیان شاعر گذرا ہے بلکہ ایک عالم دین اور پاک طینت درویش بھی۔ وہ چونکہ عالم تھے اس لئے اُس کی زبان میں فارسی اور عربی کے الفاظ بہت در آتے ہیں۔ گو کہ اُس کا انداز بیان اور طرز گفتگو بلوچی بحروں کے مطابق ہے لیکن بیشتر الفاظ زیادہ فارسی ہے جس سے جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ ایک تعلیم یافتہ شاعر کو زیب نہیں۔

فیضل لاشاری کی محبوبہ جیسا کہ وہ خود کہتا ہے کوئی مجازی ہستی نہیں بلکہ محبوب حقیقی ہے لیکن اِس محبوب کے لئے اپنے اشعار میں جو پیکر اُس نے تراشا اور پیش کیا ہے اُس کے خد و خال لاہوتی نہیں ہیں۔ بہ ہر حال اپنی محبوبہ کی ثنا میں فیضل کہتا ہے۔

کہ ناگاہ آں صنم نازاں گران ءَ

در آمد ہمچو خورشید اُبھران ءَ

مسالے گہکری پُرجان جنان ءَ

خراماں چوش کبکی لُڈ کنان ءَ

طرب تاباں اشہالی لاٹ گران ءَ

عطر مُشکاو ہینبو چاٹ گران ءَ

نقاب ءَ آش رُخ ءُ دیرء گنان ءَ

گرو دلی زبیدلکان ، چابک جنان عؔ

جبین رخشان رسالے ماہر کان عؔ

چو مہ ، خور نوُر یافت از رُوئے جہان عؔ -

یعنی کہ

اَچانک وہ صنم

ناز سے اِٹھلاتی اور خورشید کی طرح اُبھرتی

باہر آئی

اور ایسی چمکی

جیسے گھٹاؤں میں بجلی چمکتی ہے -

اور اَیسے خراماں خراماں چلی

جیسے کوئی چکوری اِٹھلاتی پھرتی ہو -

اَپنی مُسکراہٹوں سے

اُس نے خُوشیوں کی روشنی پھیلائی

اور اَپنی عطر جیسی خُوشبو سے

فضاء کو مہکا گئی -

جب اُس نے اَپنے چہرے سے نقاب ہٹائی

تو جیسے بجلی کی ایک رو

چابک کی طرح بل کھا کر گری -

اُس کا چہرہ

چاند کی طرح روشن ہے

اور جیسا کہ چاند

سُورج سے روشنی لیتا ہے

اُسی طرح سُورج

اُس کے نور سے روشن رہتا ہے۔

فیضل لاشاری کو ہم بلوچی شعراء کے اُس گروہ میں شامل کرتے ہیں جن میں میر مولاداد ریکیانی اور دُوسرے فارسی گو بلوچ شاعر آتے ہیں جنہوں نے بلوچی کو اپنی فارسی نظموں سے جلا بخشی ہے اور اِس قدر فصیح اور جاندار بنا دیا ہے کہ کوئی دقیق سے دقیق خیال اُس کے دامن میں سما سکتا ہے۔ مثال کے طور پر فیضل لاشاری کی ایک اُردو نظم کا ایک حصّہ دیا جاتا ہو جس میں وہ عام بلوچی شاعروں کے انداز میں کہتا ہے :۔

قدِ شمشاد زینت یافت از آنءَ

دو گیسو پُر شکن و نازک بیانءَ

خجل مشکِ ختن از موئے جانءَ

دو تیں ابروئیں ئیں گشتیں کمانءَ

دو نرگس مست چو جنگی ہڑانءَ

شہ مژگاں فوج را قائم کنانءَ

بہ نوکاں من دلءَ تیراں جنانءَ

دو تیں زلف بہ رُخءَ دامی تہانءَ

بہ ہر تارے ہزاراں دل گرانءَ

چو رہزن ہستہ وئی راہءَ جنانءَ

اصل گوں ہوشءَ دستیءَ ہڑانءَ

ایک گریزی افسانہ - ؟

بہ تقویٰ، زہد اتقی بہرے نہ زاناں
بہ یک عشوہ کُننی تاخت ہر دوناں ۓ۔
یعنی

قامتِ شمشاد.
اُس کی قامتِ زیبا کی مانند ہونے کی وجہ سے
قابلِ تعریف ہے۔
میں اُس کے دو نرم و نازک گیسوؤں کا بیان کیا کروں
اُن کے سامنے تو مُشکِ ختن شرمندہ ہے
اُس کے دونوں ابرو
کھنچی ہُوئی کمان کی مانند ہیں۔
اُس کی دو نرگسی مست آنکھیں
جیسے میدانِ جنگ میں تیر برسا رہی ہوں
اُس کی مژگان جنگی پلٹن کیطرح صف بستہ ہیں
اور وہ نوکِ مژگان سے
دلوں پر تیر مارتی ہے۔
اُس کی دونوں زُلفیں
چہرے پر دام بنی ہوئی ہیں
اُن کے ہر تارِ موی سے
ہزاروں دلوں کو وہ گرفتار کرتی ہے۔
اُس کے چہرے کا مُشکین خال
رہزن کیطرح راستہ روکے کھڑا ہے۔

اور راہبروں کو لُوٹ لیتا ہے۔

دراصل وہ

ہوش و مستی سے لڑتی رہتی ہے۔

میں نہیں جانتا

کہ اُسے زہد و تقویٰ سے کیا انتقام لینا تھا

کہ ایک ہی عشوے میں

اُس نے دونوں کو تاراج کر کے رکھ دیا۔

Scanned with CamScanner

(٦)

دیدارِ یار کے بیان میں

دیدارِ یار سے عشاق کو جو کیف و سرور حاصل ہوتا ہے اُس سے دلِ حزیں میں جو ولولے اور خواہشیں سر اٹھاتی اور اپنے نقوش چھوڑ جاتی ہیں شعراء نے خوب مزے لے لے کر اُن کا بیان کیا ہے بالخصوص بلوچی کے شاعروں نے اس میں ندرتِ خیال کی خوب جولانی دکھائی ہے شاعر بظاہر تو ایک خاص شخصیت یا کسی ایک خاص واقعہ سے متاثر ہو کر شعر کہتا ہے لیکن وہ شخصیت یا وہ واقعہ جب الفاظ کے پیکر میں ڈھل کر نکلتا ہے تو شاعر کے ظرف و ذوق کے مطابق اُس میں آفاقیت آجاتی ہے وہ ایک ایسی ہمہ گیر حیثیت حاصل کر لیتی ہے جسے سُن کر ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ شاعر نے اُس کے دل کی بات کی ہے، اُس کے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔

بلوچی کے دورِ متقدمین و متوسطین کے شاعروں کی بڑی خوبی یہ رہی ہے کہ

انہوں نے شعر گوئی میں عربی و فارسی گو شعراء کی پیروی کرنے کے بجائے اپنا راستہ خود تلاش کیا ہے ہر حال میں اپنی انفرادیت اور اپنے جداگانہ وجود کو قائم رکھا ہے۔ یوں کہیے کہ انہوں نے اپنی قومیت کو جہاں تک اُن سے ممکن ہو سکا ہے ایک جداگانہ اکائی کی حیثیت سے اُبھارا ہے۔ شاعری میں اپنا راستہ نہ صرف خود متعین کیا ہے بلکہ اُس پر ثابت قدمی، عزم اور پورے استقلال سے گامزن رہے ہیں اس لئے، اپنی قومی روایات، رسم و رواج اور تاریخ سے اُن کا رشتہ نہیں ٹوٹتا ہے۔ بیبگر رند ہو یا جام درک، شے مرید ہو یا توکلی مست، جس کا بھی کلام سُنیں، صاف معلوم ہوگا کہ ایک خالص بلوچ کی روح بول رہی ہے اور اس انداز سے بول رہی ہے کہ اُس کی

انفرادیت واضح ہونے کے باوجود آفاقیت میں سموئی ہوئی معلوم دیتی ہے۔

انگریزوں کے دورِ غلامی میں جب بلوچی شاعری بالخصوص ملاؤں کو منتقل ہوئی تو اس میں وہ بلوچی انفرادیت باقی نہیں رہ سکی۔ ایسا کیوں ہوا؟ یہ ایک طویل بحث ہے جو میری تصنیف "بلوچی کی رزمیہ شاعری" میں گذر چکی ہے۔ مختصر یہ کہ اپنی انفرادیت کھو دینے سے بلوچی شاعری میں خوشہ چینی کا رواج پڑ گیا اور اس میں وہ بات نہیں رہی جو ایک قوم کی زبان کو زندہ رکھنے کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب زبان میں انفرادیت نہ رہے تو قوم میں انفرادیت و یکتائی وجود کا شعور کیونکر باقی رہ سکتا ہے۔

بیبگر رِند ایک البیلا سورما اور خوش گفتار شاعر گذرا ہے۔ اس کے عشق و عاشقی کی کئی داستانیں مشہور ہیں۔ بڑھاپے کی عمر میں وہ بلوچوں کے کسی گاؤں میں سے گذرتا ہے وہاں پر اسے ایک لڑکی نظر آتی ہے جس کے متعلق بیبگر کہتا ہے:۔

دیستوں پُنتر نگے من دیرؤ ءِ نیام ءَ
سُومری ءَ گوں تنگویں سہتان ءِ
تئی چو مسروان ءِ سگاریشان
گوں من دیر ان نہ داجاتی
بلکہ منے پیری ءِ چار یان دیستہ
من بروتان دیر بگنین پریشان
لے بلا زیر ءِ جگنت گوں ایشان۔

یعنی:۔

میں نے گاؤں میں
ایک البیلی لڑکی دیکھی
ایک ایسی حسینہ

جو سونے کے زیور پہنے ہوئے تھی
اور سُرخی مائل ہری تیتری طرح
اِدھر اُدھر اِٹھلاتی پھرتی تھی
اُس نے میری طرف کوئی توجہ ہی نہیں دی۔
شاید اُس نے
بڑھاپے کے اُن غمازوں کو دیکھا
میری مونچھوں اور گھنی داڑھی میں۔
اِس کمبخت میری کی
جس سے ہمیشہ لڑائی رہتی ہے۔

جانم زرک جب اپنی محبوبہ سے ملتا ہے تو اُسے نصیحت کرنے لگتا ہے کہ دوسری طرح چہرے سے نقاب ہٹا کر نہ پھرا کرے۔ یہی بات خان، میر عبداللہ خان بھی کہتی ہے لیکن جانم زرک کے کہنے کا مقصد کچھ اور ہے کہتا ہے :۔

دوشی دل رُبا میں جانی
سرتا بعیں تیمند کا ڈانی
گوگشتاں پہ دلی نہہالی
اُوساہ، تو فخر حیرانی
گردی جاروان پروانی
جندی عاشقانی زیانی
یعنی
رات میں نے
اُس دِل لُبھانے والی محبوبہ کو

جو حسین عورتوں کی سرتاج ہے

دیکھا۔

اور دبی زبان سے اُس سے کہا!

اے میری زندگی!

تُم اس طرح ناد انوں کی طرح مت گھوما کرو

تمہاری شمع رُو کے گرد

پروانے جمع ہو جائیں گے

اور کتنی عاشق برباد ہو جائیں گے۔

جامِ دُرک نے چھوٹی تقطیع کی ایک بڑی خوبصورت نظم کہی ہے جس میں

محبوبہ کے دیدار کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ بلوچی شاعری میں بے مثال ہے۔ اُس میں الفاظ کی حسین

تسلسل اور روانی کے علاوہ جو زیر یا نغمگی ہے وہ سامع کی روح کی گہرائیوں میں اُتر جاتی ہے۔

جب ایسے اُس مخصوص لے میں جو جامِ دُرک کے اشعار کے لئے مقرر ہے گاتا ہے تو سامعین

اُٹھتے ہیں۔ جامِ دُرک کہتا ہے:۔

پیری پہ نگاہ

دیستوں دلبرء

اروا حی رسال

حیری شاہ جمال

سینہ دُمبی مار

بوستان بہ بہار

دنتانی انار۔

پچلیں گھنڈ گمان

پیچی، نگسان :
سیر ہمیں چنیاں
عیسانی مکان
ہر دو جی وچان -
یعنی:
پرسوں، اچانک میں نے
اپنی دلبر کو دیکھا -
وہ رُوح کی طرح لطیف
اور حُور کی طرح حسین ہے
اُس کا سینہ سانپ کی دُم جیسا
اور اُس کا حُسن
برستان میں آئی ہوئی بہار کی طرح ہے -
اُس کے دانت اُنار کے دانے ہیں،
جب وہ پھول کی طرح ہنستی ہے،
تو اُس کی نرگسی آنکھوں سے
مروارید برستے ہیں -
وہ میری آنکھوں میں رہتی ہے
بلکہ دونوں یعنی دل وجان میں بھی -

دینار عبداللہ خان میروانی اپنی محبوبہ کے دیدار سے جو تاثر لیتا ہے
اُسے اپنی ایک نظم میں اِس طرح بیان کرتا ہے: ؎

من دیستوں گُل ہا دیم رکھشندہ دار

چراگے کہ شہمیت پہ لنج و تہار

پہ ایوان و بادگیر نقش و نگار

پہ دوراں تچو اپاماں نت چو بامی ستار۔

یعنی

میں نے اُس کے پھول جیسے چہرے کو

(خوشی سے) دمکتے ہوئے دیکھا۔

یُوں کہو کہ گھُپ اندھیری رات میں

ایک چراغ ضو فشاں تھا

وہ اپنے نقش و نگار کئے ہُوئے بالاخانے میں

بیٹھی ہوئی تھی

وہ، دُور سے

صُبح کے ستارے کی مانند چمک رہی تھی۔

ریحان رِند کی بات دُوسری ہے۔ جس کی محبوبہ خانہ بدوش دوشیزہ

خانہ بدوشوں کی زندگی ہی سفر میں کٹتی ہے۔ آج اِس وادی میں تو کل کوسوں دُور کسی اور پہاڑ کے

دامن میں ڈیرہ ڈالا جاتا ہے۔ سنگلاخ وادیوں کا سفر اور پاپیادہ میلوں کی مسافت

طے کرنا پڑتی ہے۔ ریحان کو اس کا شدید احساس ہے اِس لئے کہتا ہے: ؎

ہوتے! منی سہتانی عگیں گودی

پیادگیءَ گوں ھمسراں تُرتیت

سریں ءَ گوں شاریں تلوءِ بندیت

ہیدی شَرزنت من ھبوہیں ہیکان

تُرپل بنتی من تنگویں دیمءِ

گَتِش گَوں پاشتاں کَنا ریحان ۔

یعنی ؎

ہائے افسوس ! کہ میری زیوروں کی گھنگوں پی پی

اپنی ہمسروں کے ساتھ پیدل چلتی ہے ۔

ریشمی دوپٹے سے اپنی کمر باندھتی ہے

سینہ اُس کے گھنیرے اور خوبصورت

گیسوؤں پر سے بہہ رہا ہوتا ہے ۔

پسینہ اُس سونے کی مانند دمکتے چہرے پر

گر کر پھیل جاتا ہے

اور وہ اپنے خوبصورت اور سڈول ہاتھوں سے

اپنا پسینہ پونچھتی ہے ۔

نوشکے کے مشہور عوامی شاعر قیصر خان فقیرزئی نے عثمان اور شے کی لڑکی کی داستان عشق نظم کی ہے ۔ بڑی خوبصورت نظم ہے جس میں عثمان کہتا ہے : ؎

من ویسنگوں شے ءِ جنِکَ

گوں دیدگاں نندی کَنِکَ

چو تامگیں شیر ءِ پیزکَ ۔[۲]

ج ءِ رہیں یہ تکہ ءَ

خاص شاپڑمی ءِ دُکہ ءَ

ارمان پہ دُتر ءِ سکہ ءَ

جت ارمن ءَ دوُر دات جُتی

---

[۱] ہم عمر ۔ [۲] گیابن جیسے ٹیڑھوں ہی بچہ جنتی ہے اس کا دودھ نکال کر ایک خاص طریقے سے آگ پر سینکا اور جمایا جاتا ہے ۔

جوڑ بوتہ ہانی ، چاکری
زبان شئے مُرید بوت آخری ۔

یعنی:

جب سے میں نے
شئے کی لڑکی دیکھی ہے
اُس کا دیوانہ ہو گیا ہوں ۔
وہ اتنی خوبصورت ہے
کہ میری آنکھوں کی پتلیوں میں
بیٹھ گئی ہے ۔
وہ تازہ دودھ کے پنیر کی طرح ہے
اب جو میں حاجی بن کر مکہ جاؤں گا
تو محض اِس لئے کہ
شاہ پری کی چوٹ کھا چکا ہوں ۔
ہائے ، ہائے ! اُس دُر تمثال محبوبہ نے
مجھے مار کر بالکل گرا دیا ہے
وہ تو (میر) چاکر کی ہانی بنی ہوئی ہے ۔
اور میں آخری شئے مُرید ہوں
جو اُس کے لئے برباد ہو گیا ہوں ۔

خان، میر عبداللہ خان کے بیٹے اور بلوچستان کے خان (میر
محبت خان احمدزئی ایک اچھے شاعر تھے ۔ اُن کی بیشتر نظمیں اگرچہ اب ناپید ہو چکی ہیں
لیکن چند ایک جو دستیاب ہو سکی ہیں اُن میں جام دُرک کا طرز نمایاں نظر آتا ہے یہی وجہ

مگر بعض گویّے آج کل اُن کی بعض نظموں کو جام دُرک کے نام سے مشتہر کر کے گانے میں ذیل میں میر محبت خان کی جس نظم سے اقتباس ہم پیش کر رہے ہیں اُس کی ابتدائی دو بیت جام دُرک کی نظم "شنگو، شادہ وشانگو" ما" سے مطابقت رکھتے ہیں اس لیے ہم توارد کہہ دیں گے، نہ کہ پوری نظم کو جام دُرک کے کھاتے میں ڈال دیں۔ میر محبت خان کی نظم ملاحظہ ہو۔

کہتا ہے :-

شنگو، من وشانگو اُمل
مان اُتلگوں چو واسں وہُمل
جوامیں سراں بازنت گرنشوک
گالے گوتساں ہچو گنوک
راہے رِواں، راہے رشوک
دوست ءَ بداراں زِردءِ توک
ہبلیچ دِلاساپاں دیوک
شر دردشم ءِ نیستن، اپوک
تیگھاں مبل مزری شروک
چوچار دُبی ماہ ءَ تہ پوک
سالے گھماں تیلانک دیوک۔

یعنی :-

(ایک دفعہ) اِدھر سے میں جا رہا تھا
اور اُدھر سے وہ اُمل آرہی تھی
ہم پھول اور خوشبو کی طرح
آپس میں گھل مِل گئے۔

اچھے لوگوں کی تعریف کرنیوالے
بہت ہوتے ہیں
ہم بھی (اُس کی شان میں)
دیوانوں کیطرح ایک نظم کہیں گے۔
اور پھر
راہروں کیطرح
اپنا راستہ لیکر چلے جائیں گے۔
ہم نے دوست کو
اپنے دل میں جگہ دی ہے۔
جہاں بیٹھ کر
وہ تنخ ہمیں دلاسے دیتی ہے۔
اُس حسینہ کی سوکن کوئی نہیں۔
اُس کے خدوخال بہت ہی اچھے ہیں
وہ تلواروں میں مزری تلوار کیطرح چمکتی
اور چودھویں کے چاند کی طرح دمکتی ہے۔
اُس کا ایک دفعہ کا دیدار
سال بھر کے لئے
ہمارے غموں کو پرے دھکیل دیتا ہے۔

میر محبت خان کے والد بزرگوار اور بلوچستان کے نامور خان میر عبداللہ خان کردار و گفتار دونوں میں مردِ میدان تھے۔ شکار کے بڑے شوقین اور رزم آرائی کے دل دادہ تھے اس کے باوجود خوش گفتار شاعر بھی تھے۔ اُن کے اشعار میں تشبیہات و استعارات

زیادہ تر شکاریوں کی آئی ہیں۔ اپنی ایک عشقیہ نظم میں کہتے ہیں:

شادھی روچ ءَ دیستگاں بے عیبیں پری
گُد تنگنت بیک ءِ پرینت گُبار ءَ مُسری
کوپگی گُٹگی گُڑن ترنت دگام گیچ کبوتری
لتّہ بیں صیدے اِمن بشتیاں بُر زعفری
شاہی دَت زانت کہ لال منی سھوکے تُنگی
گوں ہمسریں گاڈان نیست منی مہرنگ اتی ہمسری۔

یعنی

میں نے ایک دن
(کسی) خوشی کے موقع پر اُس پری کو دیکھا
جس میں کوئی عیب نہیں،
دیکھا۔
اُس نے اپنے گیسو گوندھے ہوئے تھے
اور اپنی مانگ پر دوپٹہ ڈال رکھا تھا۔
اُس کے شانے جھکے ہوئے
اور رفتار کبوتر کی تھی۔
وہ اُس صاف ستھری پہاڑی بکری کی مانند تھی
جو اُونچی اُونچی گھاٹیوں پر چرتی ہے۔
خدا جانتا ہے

ف۱ غالباً یہاں مراد سبزہ ہے۔ (ج)

کہ میری محبوبہ خالص سونا ہے

اَے مہوش!

تیری ہم عمر حسیناؤں میں

تیرا ثانی کوئی نہیں۔

ریحان رند، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے اپنی محبوبہ کی ایک پرانی قیامگاہ پر سے گزرتے وقت اُس کے خیمے کے چبوترے کے پتھروں کو دیکھ کر خون کے آنسو روتا ہے لیکن جام درک اپنی محبوبہ کے سُرخ ہونٹوں اور کالے گیسوؤں کو دیکھ کر رونے لگتا ہے۔ ملاحظہ ہو کس سادگی سے کہتا ہے:-

رکتاں من لال ءُ دیتگاں

رکتاں و رزیں جھپران

دیستہ من و گرجیتہ دِل ءَ

گرجیتہ دِل ءُ تن بیگہ ءَ۔

یعنی

مَیں نے اپنی محبوبہ کے سُرخ ہونٹ دیکھے۔

سُرخ ہونٹ

اور اُس کے ریسمان جیسے گیسو۔

مَیں نے دیکھے

تو میرا دِل رونے لگا

اور شام تک روتا رہا۔

ستو کا دیوانہ اور شاعرِ الست، توکلی مست نے ستو کو ہر رُوپ میں دیکھا اور اپنی نظموں میں بیان کیا ہے۔ توکلی مست کی نگاہوں میں ستو ہر بار ایک نئے روپ میں آتی ہے

جو اُس کے اشعار میں الفاظ کا جامہ پہن کر ایک نورانی پیکر اختیار کر گئی ہے۔ مثلاً ایک جگہ کہتا ہے :-

دیستہ من، سمّو کہ تنت مخمّا میں گدء
تنگھیں بچّی، درستہ گوں عارلیفیں پتء
درچکاں لیموی من حاکمی باگھانی تہء
بچی جوان تنت پتّکلیں رنگ و درو شمء
چیر تنت گوں مسکان، گوں لونگان و عنبران -

یعنی

میں نے سمّو کو دیکھا
اور اس نے اپنے مخمّا کے دوپٹّے سے اپنے چہرے پر گھونگھٹ ڈال دی -
وہ، لاڈلی ایسی ہے
جیسے کوئی زرجبین بیٹا
اپنے بزرگوار باپ کے زیرِ سایہ پل کر بڑا ہُوا ہو -
سمّو، لیموں کے اُس درخت کی مانند ہے
جو حاکموں کے باغوں میں اُگتا ہے
اور جس کے پتّے
اچھی شکل و صورت کو نکھارنے کے لئے
مفید ہوتے ہیں -
سمّو سے ایسی خوشبو آتی ہے

؎ ایک قسم کا پٹہ دار ریشمی کپڑا جسے مُہنا بھی کہتے ہیں - الخ

جیسے، مشک، لونگ اور عطر و عنبر میں بسی ہوئی ہو۔
توکلی مست نے سمو کو اُس دن دیکھا اور اُس کا دیوانہ ہوا جبکہ بارش سے
اپنے ہتھیاروں کو بچانے کے لیے اُس کے خیمے میں پناہ لی۔ اس واقعہ کو اُس نے اپنی نظموں میں
بارہا بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے مثلاً ایک جگہ کہتا ہے ۔

برہوں ھمو داں کہ خیمہ انت جیری
ہتھیار سوگ بنت منی میری
دلمنت تی چو ڈیوانئے بلوکیں ع
دل منی مجنا بیت ہمار ورچ ع
چلو ی شپ چہ بندگ وزاران
چہ خیالانی وشش گنگ ئیتہ بیم ۔

یعنی

(میں نے اپنے دل میں کہا)

چلو، وہاں چلیں
جہاں اُس مور شمائل کا خیمہ ہے
تا کہ میرے امیرانہ ہتھیار محفوظ رہیں ۔

سمو! تیرا چہرہ
شمع فروزاں کی طرح دمکنے لگا

اور، میرا دل

اُسی دن سے تیرا دیوانہ ہوا۔
اور میں نے زمستان کی اُس لمبی رات کو
تیرے خیالوں میں ڈوب کر

آہ و بکا کرتے ہوئے

ختم کر دیا۔

توکلی مست کو ایک دن یہ احساس ہوتا ہے کہ سمّو اسے پسند نہیں کرتی کہ وہ رات دن اُس کے خیمے کے سامنے پڑا ہے۔ سمّو کی آزردگی خاطر اُس سے برداشت نہیں ہوتی اِس لئے وہاں سے اٹھ کر وہ پہاڑوں کی راہ لیتا ہے اور سمّو کو کہلا بھیجتا ہے کہ :ـ

سمّل ! تئی لوڈاں من زہیر ءَ گیند اں

چے مرادے ءَ تئی دیرد ءَ نند اں۔

یعنی

اے پیاری سمّو !

جب میں تم کو اِس طرح

غصّے میں ٹہلتے دیکھتا ہوں

تب ، خود ہی بتاؤ

کس اُمید پر میں تمہارے ڈیرے میں

بیٹھ سکتا ہوں۔

سمّو کی بے نیازیاں دیکھ کر، کبھی کبھی توکلی مست بھی بگڑ جاتا ہے،

اُس کا بھی دِل بھر آتا ہے اور

سمّو کو تنبیہہ کرتا ہے کہ :ـ

بال کن اُو سمّو !

مئے دِل ءِ بمبلاں مزریہ

زیرے بمبلاں ،

ٹپلیتی سیلانی بکیہ

یعنی
اے سسترو! دیکھ
میرے دل کو دکھ نہ دے۔
اگر دل دکھاؤ گی
تو یہ سیلانی فقیر
تمہیں بد دعائیں دے گا۔

Scanned with CamScanner

۷

بلوچی تشبیہات کے بارے میں

جن ادوار کے بلوچی شعرا کے کلام سے ہم اقتباسات پیش کر رہے ہیں اُن شعرا کی اکثریت اَن پڑھ تھی اِس لحاظ سے بلوچی اصطلاح میں وہ "مادر زاد" اور علمی زبان میں فطری شاعر تھے۔ وہ نہ تو عربی، فارسی اور ہندی کے شعرائے متاثر تھے اور نہ ہی علم العروض سے آشنا تھے۔ اُن کا علم لدنی تھا۔ زبان اُن کی اپنی مادری زُبان تھی جس کے متعلق کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ زبان اُس نے کب سیکھی اور کیسے سیکھی ہے۔ اِس نکتہ پر تقریباً تمام اہلِ علم مانتے ہیں کہ اچھی اور اعلیٰ شاعری صرف مادری زُبان میں ہی ہو سکتی ہے۔

بلوچی کے اِن فطری شاعروں نے دانستہ یا نادانستہ طور پر اپنی مادری زُبان بلوچی کی جو خدمت کی ہے اور مسلسل صدیوں سے اُسے جس انداز سے زندہ و تابندہ رکھا ہے وہ نہ صرف قابلِ قدر ہے بلکہ ہم بلوچوں کے لئے قابلِ فخر اور قابلِ صد ہزار تحسین بھی ہے۔ اِن ناخواندہ شاعروں نے جو زُبان استعمال کی ہے اور جیسی نادر تشبیہات و استعارات سے کام لیا ہے ہم یہ دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ آج کا کوئی بڑے سے بڑا تعلیمیافتہ بلوچ شاعر اُن کی زُبان پہ خوردہ گیری کی جراُت نہیں کر سکتا۔

بلوچی کلاسیکس میں شے مُرید و ہانی کی روایت صحیح ہے یا کسی شاعر کی خود ساختہ داستان، ہمیں اِس سے بحث نہیں۔ ہمیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ اِس داستان سے بلوچی زُبان و ادب کو جو قابلِ قدر فائدہ پہنچایا گیا ہے اُس سے استفادہ کیسے کیا جائے۔ جہاں تک بلوچ عوام کا تعلق ہے انہوں نے اِس داستان کو سینے سے لگایا اور اُس کی قدر کی ہے۔ اُس پہ بلوچ

صدیاں گذر جانے کے باوجود ابتک، اُنہوں نے شے مُرید کی داستانِ عشق کو تازہ اور اُس کے کلام کو زندہ رکھا ہے۔

شاعری میں تشبیہہ استعارات کا استعمال ایک ایسا فن ہے جس سے بہت کم شاعر کما حقہٗ عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ جن شعراء کو اِس فن میں دسترس حاصل رہی ہے اُن کا شمار اُن قادر الکلام شعراء میں ہوتا ہے جو شہرت دوام حاصل کر چکے ہیں۔

بلوچی شعراء میں سے شے مُرید، جام دُرک اور توکلی مست اس فن میں استاد مانے جاتے ہیں۔ اُنہوں نے بلوچی کو ایسی نادر تشبیہات سے مالا مال کیا ہے جس کی نظیر بعد کے شعراء کے کلام میں بہت کم ملتی ہے۔

ایک چاندنی رات میں شے مُرید ہانی کو میر چاکر کی ماڑی¹ کی چھت پر کھڑا دیکھتا ہے موج میں آ کر اپنے اشعار میں اُس کی ایک ایسی تصویر اُتارتا ہے جو رہتی دنیا تک یاد رہے گی۔ کہتا ہے :-

دوشی کہ چ و ماہ چیار دہی
ہمگو بیتگی اُوشتا تگنت۔
چہ ماہ ءَ کہ چ ءِ رنگ شنز ترتگنت
ماہ ءَ گوں گہار ءَ من ڈپ ءَ۔
ہانی ، چہ شیر ءَ شنز ترتنت
شیراں کپ و گجی پر تنت۔
یعنی :-

رات وہ حسینہ اور چودھویں کا چاند

---

¹ بالاخانہ

دوش بدوش کھڑے تھے

اُس حسینہ کی صُورت چاند سے بہتر تھی

(کیونکہ) چاند کے چہرے پر غبار چھایا رہتا ہے

ہانی تو دُودھ سے بھی اچھی ہے

دُودھ پر بھی تو جھاگ آجاتا ہے۔

شاہ مُرید کی نگاہوں میں اگر دُنیا میں کوئی حسین صُورت ہے تو وہ ہانی کی ہے جس جیسی اور کوئی نہیں۔ کہتا ہے : ؎

کر ہیرِی کیکے، پر سُنگ گاماں ایرکنت
تَہ میں ملے، گرونی چہ دُرستاں دراجترِ نت
مِنتَلیں آنکے، گوں گُہاراں لوڈ نہ بیت
نہادی چہ گُہارانی نہاداں، سنگین ترِ نت
گُتی چہ گُلاں جہان ءِ گستا ترِ نت
نود کہ بنداں بنت ہانگُل ءِ ریزیں گُہپرِ نت
نود کہ گواران بنت ہانی ءِ ارسں تنت تُرُونگلیں۔

یعنی

ہانی ، ایک سُبک خرام پہاڑی چکور ہے ،

ایک سُتھرا سا سپے

اُس کی گردن سب سے لمبی ہے

ایک ہرنی ہے

جو دُوسروں کے ساتھ مل کر نہیں چلتی

وہ اپنی نشست و برخاست میں

اپنی دوسری سہیلیوں سے زیادہ سنگین ہے۔
اُس کا خیمہ بھی
دُوسرے خیموں سے علیٰحدہ ہے۔
جب بادل اُمنڈ کر آتے ہیں
تو ہانی کے ریشمان جیسے گیسو گھنے ہیں
اور جب بادل برستے ہیں
تو ایسا لگتا ہے کہ ہانی آنسو بہا رہی ہے۔

اِس مضمون کو ایک اور نظم میں شے مُرید نے ذرا مختلف انداز میں بیان کیا ہے۔ کہتا ہے ؎

جُھٹیں آسکے گوں گہاراں ہور نہ بیت
تُنی بھر گوشکے، ہر زمان سُر تلّان چِریت
گرات جتین ھیدے کہ من آسیا ھبندان ہزیت
تُرونگلیں آپے کہ باشاجواں تچیت
لُتہ تیں مارے کہ دراج کشیت گردن ءَ۔

یعنی

ہانی، ایک ہرنی ہے
جو ہرنیوں کے جھرمٹ میں بھی منفرد ہے
دامن کوہ کا ایک ایسا خرگوش ہے
جو پہاڑوں کی بلندیوں پر چرتا ہے۔
ایک ایسی پہاڑی بکری ہے
جو انسان کی بُو سُونگھ کر بِدکتی

اور کالے پہاڑوں کے اُونچے سلسلوں میں جا کر
چھُپ جاتی ہے۔
وہ، پہاڑی ندیوں میں بہنے والا
اولوں کا سا ٹھنڈا پانی ہے
وہ، ستھرا سا سانپ ہے
جو ہمیشہ اپنی گردن اُونچی رکھتا ہے۔

شے مُرید کے لئے ہانی مُجسّم خوشبو ہے، اُس کی ہر ادا دل نشین اور اس کا ہر اندام دلکش ہے۔ اُس نے اپنی نظموں میں ہانی کی، ایک دیوی کے پیکر میں پرستش کی ہے۔ کہتا ہے:۔

مُشک شُنزنت چہ مُبوپیں بیکاں
سُنبُل و نوک رودیں گوراں و شبر۔
کنت گیسے پہ ریہدگیں چماں
ہر دَم ءُ ریسینیت گوزءِ درتماں
چمی بے کچی کجل ءُ سیاہ تنت
لُنٹ بے مسواک ءُ گُل بہ صورت تنت۔

یعنی:

اُس کے گھنیرے گیسوؤں سے
مُشک برستا ہے۔
اُس کے سُنبل جیسے زرخیز پستانوں سے
خوشبوؤں کی مہک آتی ہے۔
وہ اپنی سُرخ، مخمور آنکھیں

ایک دلبرانہ شان سے مٹکاتی ہے،
اور ہر وقت
اپنی گردن کے ہار سے کھیلتی ہے۔

اُس کی آنکھیں
کبھی کا کاجل لگائے بغیر
سیاہ ہیں۔
اور اُس کے ہونٹ
دنداسہ ملے بغیر
سُرخ ہیں۔

بلوچی کے شاعروں نے محبوبہ کی گردن کو کُونج کی گردن سے بھی تشبیہہ دی
کُونج اگرچہ بلوچستان کا پرندہ نہیں لیکن موسم سرما میں رُوس سے سندھ و ہند کی طرف
وقت اور موسم بہار میں وہاں سے واپس ہوتے وقت چند دنوں کیلئے بلوچستان کے میدانوں
میں قیام کر لیتی ہے۔ آسمان پر اُڑتے وقت اُن کی چیختی چلاتی قطاریں بہت بھلی لگتی ہیں۔
شے مُرید کہتا ہے: ؎

ہانی گوں کُونجی گردن ءَ
گُون تنگوُ و مرواریدان
در ہینے من جیڈی ہمسران۔

یعنی:

ہانی، اپنی کُونج جیسی گردن میں
موتی ٹکے طلائی ہار پہن کر
اپنی ہم عُمر سہیلیوں میں

دھنک کی طرح لگتی ہے۔

بُلبُل کا ذکر بلوچی شاعری میں صرف دورِ متاخرین کے شعرا کے کلام میں کہیں کہیں ملتا ہے۔ قدیم شعرا نے بُلبُل کی بجائے کبوتر، قمری اور فاختہ کی خوش الحانی کو محبوبہ کیلئے بطورِ تشبیہ استعمال کیا ہے۔ بُلبُل بلوچستان میں بہت کم نظر آتا ہے غالباً یہی وجہ ہے کہ بلوچی کے شاعروں نے اُس طرف زیادہ توجہ نہیں دی ہے۔

ذیل میں جس نظم سے ہم اقتباس پیش کریں گے وہ غالباً نوشکے کے مشہور شاعر فقیر شیر جان کی ہے، ایران کی سرحد پر واقع ہونے سے اِس علاقے کے اکثر شعرا فارسی شاعری سے متاثر ہوئے ہیں اور یہی بُلبُل کی تشبیہ لانے کا سبب ہے۔ شاعر کہتا ہے: ے

من شُتوں سَیل ءُ ویشگوں آھُو ئیں گل ءُ

بلبلے وانیت پرہما درچکانی تہ ءُ

آوازاں کشیت وبنداں سِندیت اَش دل ءُ

سار وبے سار وں من پما لال ءُ گندگ ءُ۔

یعنی

(ایک دن) میں سیر کو گیا

وہاں پر مجھے وہ خوبصورت ہرنی نظر آئی۔

جو، بُلبُل کیطرح

درختوں میں چھپ کر گا رہی تھی

وہ ایسی خوش آواز تھی

کہ اُس کی آواز میرے دل کے تاروں کو

توڑتی چلی گئی۔

(اُس دن سے) میں اُس دُردانہ کا

Scanned with CamScanner

دیوانہ ہوا ہوں۔
کبھی ہوش میں آتا ہوں
اور کبھی بے ہوش ہوتا ہوں۔

شاہداد و ماہناز کی داستانِ عشق، بلوچی شاعری میں کئی اچھی نظموں کا باعث ہوئی ہے۔ جن شعرا نے اِس موضوع پر داستان سرائی کی ہے اُن میں خود ماہناز بھی شامل ہے۔ ماہناز نے اِس داستان کے جو اشعار کہے ہیں اور اُن میں تشبیہات کے جو موتی پروئے ہیں وہ قابلِ تحسین و ستائش ہیں۔ اُن سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ اس شاعرہ کو جو بلوچوں کے ایک اعلیٰ قبیلے کے اعلیٰ خاندان سے تھی، زبان و بیان پر کتنی دسترس حاصل تھی اور وہ اپنے ماحول اور معاشرہ کے تقاضوں سے کتنی واقفیت رکھتی تھی۔

داستان کے مطابق شاہداد رند نے اپنی بیوی ماہناز پر جو نوحانی قبیلہ سے تھی کچھ جھوٹے الزام لگائے اور اُسے طلاق دے دی۔ ماہناز نے اپنی پاکدامنی سے متعلق جو نظم کہی ہے اُس میں دوسری باتوں کے علاوہ وہ کہتی ہے :-

من ہما اَنجیراں پُتّن تاکین
کہ تنگ ترّیں کُنٹ بانی ہسرءَ رُستہ۔
من ہما جی نیزوں گرو گتی
دکّن ءِ گوات کہ اِچ گوترے کشیت۔
اُکسرءُ در تیچکانی سراں چنڈیت
(بلے) سر منی ہچ گوات ءَ نہ چنڈینتہ
بُن منی ہچ ہور ءَ نہ ہیینتہ
جیگ منی جا میں ہومرءَ بستہ
گوری گِندیت یا ہومری بوجیت۔

یعنی:

مَیں انجیر کے چوڑے پتوں والا' وہ درخت ہوں
جو تنگ گھاٹیوں میں
پانی کے گہرے گڑھوں کے کنارے اُگتا ہے۔
میں چٹانوں اور گھاٹیوں کا' وہ سربُلند پیڑ ہوں
کہ جب جنُوب کی تند و تیز ہوائیں چلتی ہیں
تو اکثر درختوں کے سَر جُھکا دیتی ہیں
لیکن میرا سَر' اَب تک
کوئی بھی ہوا نہیں جُھکا سکی ہے
اَور نہ ہی کوئی بارش
میرے تنے کو تر کر سکی ہے۔
میرا گریبان جامِ عُمر نے باندھا ہے،
اَب میرا بَدن قبر دیکھے گی
یا پھر جامِ عمر ہی میرا گریبان کھولے گا۔

جام دُرَک. گھومنے پھرنے والا ایک سیلانی شاعر تھا۔ کبھی سبیلہ و مکران میں ہوتا تو کبھی کچھی اور کوہستان مری بگٹی میں، کبھی قلات میں ہوتا تو کبھی خاران و چاغی کی وادیوں میں دید و نظر کو دعوتِ نظارہ دیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ کچھی کی بستی میں جو غالباً جتوں کی تھی اُس نے رات گذاری۔ جتنیوں کا حُسن اور اُن کی ادائیں دل کو لُوٹنے والی ہوتی ہیں۔ جام دُرَک کو دُوسرے دن صبح کو ایک ایسی حسینہ سے واسطہ پڑا جو حُسن و دلرُبائی کی ایک مُورت تھی۔ جامِ دُرَک کہتا ہے:-

صبائی ، بانگو ءِ من پاد کایاں

جنے کبیت اَچ مَن و دیما رُدان ءَ

دوئیں سرکوپگاں، چاپ ءَ جنان ءَ

تَرَ ہوکیں ماذہبیں گھنڈاں دیان ءَ

دوئیں چم کدہ ءِ میں، آسی بلان ءَ

مُرَءِ پونزے، گوشتے تیگہے بھوکین

بسّتہ اَچ عاشق ءِ جان ءِ گوزدکین ۔

یعنی

علی الصبح، جب میں اُٹھ کر جانے لگا

تو سامنے سے ایک عورت آتی دیکھی

جو دونوں ہاتھ کندھوں پر سے اُوپر اُٹھائے

تالیاں بجاتی

اور وحشی گھوڑی کی طرح اچھلتی کودتی

میری طرف بڑھی چلی آ رہی تھی ۔

اُس کی کٹوروں جیسی آنکھیں

چراغ کی طرح روشن تھیں

اُس کے چہرے پر ناک

گویا، ایک ایسی تیغ بُرّاں تھی

جو ایک ہی وار میں

عاشقوں کی جان لے لیتی ہو ۔

بلوچی کے شعراء نے بعض ایسی تشبیہات استعمال کی ہیں جو اُردو دان اُدبا، وشعراء کو بہت عجیب لگتی ہوں گی ۔ جیسا کہ محبوبہ کی کمر کو ڈمبو یا بھڑ کی کمر کہنا ۔ سینے کو ”مار“ یعنی سانپ

کی دُم سے تشبیہ دینا، ناک کو تلوار، تیغ یا خنجر کہنا اور خود محبوبہ کو کشتہ میں مار یعنی ستھرا سانپ یا ایسا سانپ جس پر کینچلی یا جھلی نہ ہو، کہنا وغیرہ کئی اور ایسی تشبیہات ہیں جو صرف بلوچی کے شاعروں کے ہاں ملتی ہیں جو اُن کی خانہ بدوشانہ زندگی کے مناظر کا عکس پیش کرتی ہیں جو اُن کے ذاتی تجربات کے نتائج ہیں اِس لئے مناسب حال اور جائز ہیں۔ جام دُرک کو ایسی نادر تشبیہات وضع کرنے میں یدِ طولیٰ حاصل رہا ہے۔ ایک نظم میں اپنی محبوبہ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے: ۔

منی دل جوڑتہ ڈیل ءَ تئی ءَ ۔
بیئے تو آسکلو، پٹّ ءَ چرِ وکین
منی تزیچی باں، پہناد ءَ گِر وکین
بیئے تو بارگیں تازی بچو کین
منی اُزوار باں، چابک جنو کین
بیئے مچھلی کہ من بیتّ ءَ رُدوکین
منی بینگ نہنگ دم دم کنوکین
ہمو چھلّ ءِ دپ ءَ واس ءَ گِر وکین۔

یعنی:

(اے حسینہ)
میرا دل تم پر آ گیا ہے۔
اب اگر تم
میدانوں میں چرنے والی ہرنی بنو گی
تو میں بند وقچی بن کر تیرا پیچھا کروں گا۔
اگر تم تیز دوڑنے والی پتلی گھوڑی بنو گی

تو مَیں اُس پر چڑھنے والا چابک سوار بن جاؤں گا۔

اور اگر تم میدانوں میں کِھلنے والا پھُول بنو گی

تو مَیں رَس چوسنے والی، شہد کی مکھی بن جاؤں گا

اور تیرے پھُول کے مُنہ کا بوسہ لیا کروں گا۔

جام دُرَک کا یہ انداز ایک دو اور نظموں میں بھی ملتا ہے۔ مثلاً ایک دُوسری نظم میں اپنی محبُوبہ سے کہتا ہے:۔

تُوے چاردہی ماہ، مَن ماہ ءِ گھُب

تُوے روچ نیمروچ، مَن اَیرکوان

تُوے گردگیں ہَگت، مَن گھوڑوان

تو جاکان نیمٹے، مَن تئی چیتران

تو پادان شپادے، مَن تئی لیتران

تُوے سیاہیں سیاہمار، مَن جوگی سران

منڈراں جنان ءَ، مَن دستی گران۔

یعنی

اگر تم چودھویں کا چاند ہو

تو مَیں چاندگرہن ہوں۔

اگر تم دوپہر کا سُورج ہو

تو مَیں غروبِ آفتاب ہوں۔

اگر تم اُونٹوں کا مُدوّر گلہ ہو

تو مَیں گھوڑسوار ہُوں

اگر تم خاک پر لیٹو گی

تو میں تیرے لئے فرش بن جاؤں گا۔

اگر تم ننگے پیر ہو

تو میں تیری جوتی بن جاؤں گا۔

اگر تم کالی ناگن ہو

تو میں جوگی بن جاؤں گا۔

اور فریب کی مرلی بجا بجا کر

تم کو ہاتھ سے پکڑ لوں گا۔

جام درک کی ایسی تشبیہات عجیب و حیرت انگیز سہی لیکن بلوچ عوام [میں] اس کے کلام کو زندہ و جاوید رکھنے کی ایک بڑی وجہ بھی ہے۔ تعلیم یافتہ حضرات بیشک [ا]ن مضامین پر حیرت زدہ ہوں اور انہیں ناپسند کر کے کوئی بھی نام دیں مگر، بلوچ عوام کے دل و دماغ [پ]ر سے ان کے اثر کو کم نہیں کر سکتے۔ گویا، جب جام درک کی مخصوص لے میں ترنم سے ان اشعار [کو گا]یا جاتا ہے تو سامعین پر وجد و کیف کا ایک سماں بندھ جاتا ہے یہی جام درک کے کلام کی [ع]ظمت کی دلیل ہے۔ اپنی اسی طرز کی ایک اور نظم میں جام درک کہتا ہے:۔

اُتی، ماہ ءُ بڑجے من سیاہیں شپان

اُتی اگر روک ءُ چیلک، من گہگران

اُتی، زہم ءِ چوکیں، من کوپگان۔

یعنی

اگر چاند کی روشنی کا مینار ہے

تو میں کالی رات ہوں۔

اگر بجلی کا کوندا ہے

تو میں کالی گھٹا ہوں۔

اُمل اگر گرنے والی تلوار ہے

تو میں اُس کو روکنے والا کندھا ہوں۔

جام دُرک کے بعد خانے بُزدار نے بھی اسی انداز میں ایک نظم کہی ہے

خانے بُزدار کی نظم کے ابتدائی چند بیت ملاحظہ ہوں کہتا ہے :-

اُمل سہتے، تہ من سوداگرانی
ہزاراں بیت گرں لکھاں گرانی
اُمل مُرگھے، من بازے بان گرانی
اُمل مارے، شہ باثہی گرمنانی
اُمل درشکے، وِریشکے بان ورانی

یعنی

اُمل اگر ایک زیور ہے،
تو میں اُس کا خریدنے والا سوداگر ہوں،
اگر اُس کی قیمت ہزاروں میں ہو
تو میں اُسے لاکھوں میں خریدوں گا۔

اگر اُمل ایک پرندہ ہے
تو میں باز بن کر اُسے پکڑ لوں گا۔
اگر اُمل سانپ ہے
تو میں اُسے ہاتھ سے پکڑنے والا جوگی ہوں۔

اگر اُمل درخت کا میوہ ہے
تو میں چڑیا بن کر اُسے کھا لوں گا۔

جام دُرک کی پیروی میں کئی اور شاعروں نے اس طرز میں نظمیں کہی

ہیں۔ محل و موقع کے مطابق جن کا بیان آتا رہے گا۔

جام دُرک کی شاعری ساون کی گھٹاؤں کی طرح ہمکتی، کڑکتی بجلیوں کو آغوش میں لئے بلوچستان کے کوہستانوں، وادیوں اور دشت و صحرا کو موسلا دھار بارش کی جھڑیوں کی طرح اپنے اشعار سے جل تھل کر دیتی ہے۔ اس کی ہر نظم کوہستانی ندی کی طرح اٹھلاتی، بل کھاتی، رواں دواں بڑھتی چلی جاتی ہے۔ جام دُرک کا پیار گل و بلبل کا پیار ہے اس لئے وہ اپنی محبوبہ سے کہتا ہے:۔

تو بہارے اُو مئے بہار ءِ گُل
شہ تئی واس ءِ من مست چو بُل۔

یعنی

اے میرے بہار کا پھول
تم خود مجسم بہار ہو۔
اور میں بلبل کی طرح
تیری خوشبو سے مست ہوں۔

جام دُرک کا ہر انداز نرالا ہے، جب وہ اپنی محبوبہ کو نصیحت کرتا ہے تو بھی اس میں ستائش کے پہلو کو نظر انداز نہیں کرتا۔ چنانچہ کہتا ہے:۔

گالاں مئے گوش دار، او جام ءِ جگر
لے کوڑی فناں، دنیا حاک ور
گش ءِ نہ بُرتہ جہاں توڑی سر
من باگھاں گھنین، تو ءِ باگھ بر
اگں تو نہیا ئیے منی سوبھ سر
لے زبریں زبا ءِ شاعر ءِ بیت بر۔

Scanned with CamScanner

یعنی

اے جام کا جگر (محبوبہ) !

میرے اشعار کان کھول کر سن لے۔

یہ دُنیا فانی ہے

یہ سب کچھ مٹی میں مِل جائے گا

اَبدی زندگی کسی کو حاصل نہیں ہے۔

تُم ایک اچھے باغ کے ثمر ہو

اُے پیاری !

اگر تُم میرے پاس نہیں آؤ گی

تو شاکر کی رسیلی زبان کا ثمرہ بھی

تلخ ہو گا۔

محبُوبہ کے فرمان سے سرتابی کرنا، عاشق کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ جام دُرک نے اِس مضمون کو جس خُوبی سے باندھا ہے وہ اُس کی اُستادی اور گویائی کے کمال کی دلیل ہے۔ کہتا ہے وَ ے

نہ کناں مں، چہ دوست ءِ فرمان ءَ

چو اسپرءِ دمیانی کناں جان ءَ

پہ چابک و چمّ دید ءِ پیکان ءَ

یعنی

مَیں اپنی محبوبہ کے فرمان سے

سرتابی نہیں کر سکتا۔

بلکہ اُس کے تیز نگاہ

اور، تازیانۂ چشم کے سامنے
اپنی جان
ڈھال کی طرح پیش کر دوں گا۔

مُلّا فاضل رند، اپنی محبوبہ کو اگر ایک طرف بجلی سے تشبیہ دیتے ہیں تو دوسری طرف اُسے اَنار کا غنچہ بھی کہتے ہیں۔ یہ ضیائے حُسن اور عارضِ گلگون کی ایک اچھی تشبیہ ہے۔ کہتا ہے :-

لال، گروکے من گہکرے بشتی
یا اَنارے من بیثگاں بُشتی
گروہنگاں بیماریں دِلے کُشتی

یعنی :

میری محبوبہ :
ساون کی گھٹاؤں کی بجلی ہے۔
یا، ایسا اَنار ہے
جو ہفتوں میں پکتا ہے۔
اُس کا دہن
اَنار کا ایک ایسا غنچہ ہے
جو بیماروں (عاشقوں) کے دل کو لبھاتا ہے۔

لانگو رند، بظاہر مرجان کے ٹیلوں پر اُگی ہوئی بیریوں میں لگے بیروں کی تعریف کرتا ہے لیکن بیروں سے مُراد اُس کی محبوبہ ہے جو ایسے نامُساعد حالات میں پل کر بڑی ہوتی ہے۔ بیری کے پھل کو اپنی محبوبہ سے تشبیہ دے کر لانگو رند نے جو ندرت پیدا کی ہے اُس کی نظیر بلوچی شاعری میں پہلے نہیں ملتی۔ کہتا ہے :-

پگنت بھنائی گنءَ سھورین
سھورنت چو دوست ءِ کاگھدیں رکان
زردنت چو مھلنج ءِ کلائیان
کیپنت چو دوست ءِ گدہ ئیں چمّان
پُلنت چو لال ءِ پنبویں جھدّان۔

یعنی
مرتبان کے ٹیلوں پر اُگی ہوئی بیریوں کے
بیر پک گئے ہیں۔
جو میری محبوبہ کی کاغذی ہونٹوں کی طرح سُرخ
اور مہلنج کی کلائیوں کی مانند زرد ہیں
اور اُس کی کٹوروں جیسی آنکھوں کی طرح
کیف سے بھری ہوئی
اور اُس کی گھنی چوٹیوں کی مانند
گھنیری ہیں۔

توکلی مست نے اپنی محبوبہ سمّو کیلئے جو تشبیہات استعمال کی ہیں وہ سادہ اور عام فہم ہونے کے علاوہ بلوچوں کے بادیہ نشین معاشرے کے مطابق اور موزوں ہیں اس لئے جب ایک سیدھا سادہ بلوچ اِن کو سنتا ہے تو جھٹ اُس کی سمجھ میں بات آجاتی ہے۔ سمّو کی صورت و سیرت اور گفتار و کردار کی تصویر توکلی مست نے پیش کی ہے اُس سے بہتر شاید ہی کوئی خانہ بدوش اور ناخواندہ شاعر اُسے پیش کر سکتا ہو۔ توکلی مست کہتا ہے:-

سمو، چہ زین ءِ پیپلاں یکے

یا ہما مُرگ ئنت کہ نامی موران انت

یا، ہما نوک ءَ تیج داتگیں تیگھ ئنت

یا، ہما انجیر ئنت پچّن تاکیں

بُرز ءَ من گٹ ءِ سرءَ رُستہ۔

یعنی:

سمو، زین پہاڑ کے

پیپل کے درختوں میں سے ایک ہے۔

یا، وہ پرندہ ہے کہ جسے مور کہتے ہیں

یا، وہ تلوار ہے

جسے تازہ ابھی ابھی صیقل کیا گیا ہو

یا، انجیر کے چوڑے پتّوں والا وہ درخت ہے

جو اُونچی گھاٹیوں پر اُگتا ہے۔

توکلی مست اور سمّو کی داستانِ عشق کی ابتدا یُوں ہوئی کہ ایک دفعہ توکلی کہیں جا رہا تھا کہ راستے میں اُسے بارش نے آ لیا۔ بارش سے بچنے کے لئے اُس نے اُن خیموں کا رُخ کیا جو اُسے نظر آئے اور جہاں سمّو بھی رہتی تھی۔ اتفاقاً توکلی کو پناہ بھی سمّو کے خیمے میں ملی۔ بارش سے سمّو کے خیمے کی ایک طناب اُکھڑ گئی۔ سمّو خیمے سے باہر آئی اور طناب کو کھینچ کر کھونٹے سے باندھنے لگی۔ اِس وقت جو بجلی چمکی توکلی مست کی نگاہیں سمّو کی صُورت سے ایسی ٹکرائیں کہ پھر اُسے اپنے تن بدن کا کوئی ہوش نہیں رہا۔

ؔ مری۔ بگٹی علاقہ میں ایک پہاڑ کا نام۔ ایم

توکلی مست نے بعد ازاں اپنی کئی نظموں میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ذیل میں جس نظم سے ہم اقتباس پیش کر رہے ہیں وہ عنوان زیر بحث کے مطابق ہونے کے علاوہ زیادہ مفصل اور تشبیہات سے بھرپور ہے کہتا ہے: ؎

واچڑاں گُھلّ ءَ بانُزری ستہ
گوات ترپیان ءَ، شار سرءَ بُرتہ
دیتی ءِ دیر گینداں گھلو گیناں:
زلفی چو سیاہ ماراں رِڑدگیناں
زہر نت چو گنڈیاں بہو گیناں
ترنت چو آہوواں ترہو گیناں
گُزنت چو ڈیوا ءَ بلو گیناں
بشنت چو بیمیاں بہشتیگاں
اُمب واٹمراں مکراں شیگاں۔
لاٹ کنت چماں پُرخماریناں
عاشقاں جاگینی قراریناں۔
دل منی مجنا بی، ہماردشی
ترد بیزار باں ہست و مدہوشی۔

یعنی:
بارش اور جھکڑوں نے
اُس کے خیمے کی طنابیں توڑ دیں۔

تیز ہوا
اُس کے سر سے دوپٹہ اُڑا کر لے گئی:

میری حیرت سے کھلی ہوئی آنکھوں نے دیکھا، کہ
اُس کی کھلی ہوئی زُلفیں
کالی ناگن کی طرح لٹک رہی تھیں
اُس کے ابرو
تیغِ بُرّاں کی طرح کشیدہ تھے۔
اُس کے بال
وحشی ہرنیوں کے ڈرے ہوئے غول کی طرح منتشر تھے
اُس کی آنکھیں
شمعِ فروزاں کی طرح روشن تھیں
اُس کے ہونٹ
جو بہشت کے لیموؤں
اور مکران کے آموں اور انگوروں کی طرح میٹھے ہیں
بھینچے ہوئے تھے
جب وہ اپنی مخمور آنکھیں اُوپر اٹھاتی
تو عاشقوں کے سوتے ہوئے دلوں کو جگا دیتی۔
اُسی دن سے
میں اُس کا دیوانہ ہُوا۔
اور مست و مدہوش ہو کر
دُنیا ترک کر دی۔

جہاں بات تشبیہ و استعاروں کی ہو رہی ہو وہاں رحم علی بنجار کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ رحم علی کی شاعری ایک وطن دوست اور قوم پرور مجاہد کی شاعری ہے۔ وہ

اپنی بات بے لگی لپٹی کہہ دینے کا عادی ہے۔ تشبیہہ و استعارہ کا سہارا لینے کی ضرورت اپنی شاعری میں محسوس نہیں کرتا لیکن کبھی کبھی کرتی پھبتی ہوئی تشبیہہ بھی کہہ دیتا ہے جیسا کہ حسیناؤں کی بیوفائی کا ذکر کرتے ہوئے اُس نے کہا ہے :-

سُورمری بے سِیتین نہ پادا رنت پچوروان !
بانگھی سانت پہ تکرغی کلنت وَروَنت۔
بُزگاں کشنت، کلنت گوں تُنّگی مَیں دِلاں۔
پُرّیں ہیران انت، گوں ہرکس ءَ دیما دپ سرنت
نگلیں باگھنت، گوں ہرکس وَ چنڈگی ءَ رچنت۔

یعنی

اے نوجوانو !
یہ حسینائیں بے فائدہ اور بے وفا ہیں
یہ صبح کے سائے کی طرح ہیں
جو جلد چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ !
یہ پہلے تو بلندیوں پر چڑھا دیتی ہیں
پھر، دِلوں کو پیاسا چھوڑ کر چلی جاتی ہیں
یہ بھرے ہوئے برتن ہیں
جو ہر کسی کے سامنے کھلے پڑے ہیں۔
یہ درختوں کے پکے ہوئے پھل ہیں
جو ہر کسی کے ہلانے پر گر پڑتے ہیں۔

۸

عاشقانہ بانکپن کے بیان میں

بلوچی کی کلاسیکی شاعری، اگر سچ پوچھا جائے تو عاشقانہ بانکپن کی شاعری ہے۔ بلوچی کے بہت کم شاعر ایسے گذرے ہیں جنہوں نے اپنی داستانِ عشق رقم نہیں کی ہے۔ قدیم و متوسط دور کے شعراء عموماً ایسے البیلے اور بانکے نوجوان گذرے ہیں جیسے بیبرگ رند، ہیبتان بیبرگ، شاہداد چاکر، ریحان رند، گیّا اور حمّل جیئند وغیرہ جو علی الاعلان عشق لڑاتے اور پھر ببانگِ دہل اپنی داستانِ عشق سُناتے رہتے تھے۔ وہ قبائلی لڑائیوں میں بھی مردانہ وار سر دھڑ کی بازی لگاتے اور میدانِ عشق میں بھی اپنی جانبازی کے جوہر دکھاتے تھے۔ اُن کی ہمت، شجاعت اور بانکپن کی وجہ سے اُن کے کلام کو ابتک عوام و خواص میں بہت پسند کیا جاتا ہے گو کہ اس پیرایۂ سخن کی پاداش میں اُن میں سے بعض شاعروں کو اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑے لیکن یہ طرزِ بیان مقبول رہا۔ یہاں تک کہ دورِ متاخرین کے شعراء جن میں اکثریت مُلّاؤں کی تھی اور جن کو انگریزوں کے دورِ غلامی میں ایسی آزادیاں جو قبائلی دور میں تھیں، حاصل نہیں تھیں اور نہ ہی خود اُن میں اتنی ہمت و جرأت تھی کہ ایسی خطرناک عشق بازی کرتے لیکن اس کے باوجود وہ بھی اپنی عشقیہ نظموں میں عشق و عاشقی کے وہی سُر الاپتے رہے، جن میں بیبرگ رند اور حمّل جیئند جیسے البیلے امیرزادے نغمہ سرائی کر چکے تھے۔ مُلا فاضل، مُلا قاسم، ملک دینار، میر عبدالکریم رئیسانی، میر عبدالکریم ساجدی اور زرگر حسن بھی وغیرہ بیسیوں ایسے شاعروں کے نام گنوائے جا سکتے ہیں جنہوں نے، محض اپنا شاعرانہ کمال اور جولانیٔ طبع دکھلانے کے لئے ایسی عشقیہ نظمیں کہی ہیں جو بظاہر اُن کی سرگذشت معلوم

Scanned with CamScanner

ہوتی ہیں مگر درحقیقت محض گپ بازی سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتیں اس لئے۔ اُن میں لفاظی کے علاوہ اور کوئی جاذبیت نہیں ہوتی۔ شاعری میں بات تو تب ہی بنتی ہے جب بات شاعر کے دِل سے نکلتی ہو، فرضی داستانیں گھڑنا اور اس طرح گھڑنا کہ اپنی سرگذشت معلوم ہو فن تو ہو سکتا ہے لیکن، اُسے جاندار فن نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ محض بڑا بول اور شاعرانہ تعلّی یا ڈینگ بازی اُس کے لئے موزوں نام ہو سکتا ہے۔

ہم نے اِس شاعری کو جس کی ابتدا بی بجر رِند سے ہوتی ہے، "عاشقانہ بانکپن" کا نام دیا ہے۔ اِس میں شاعر اپنے عشق کی رنگین داستان خود بیان کرتا ہے۔ ہم اسے تسلیم کرتے ہیں کہ ان میں سے بعض کئی داستانیں دُوسرے شاعروں نے کہی ہوں گی جیسا کہ "دوستین و شیریں"، "شیرین فرہاد" اور "لیلیٰ مجنوں" جام دُرّک کی کہی ہوئی نظمیں ہیں مگر چونکہ شاعر ایسی نظموں میں عموماً صیغہ واحد متکلم کا استعمال کرتے ہیں اس لئے یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ کہنے والا خود دوستین یا فرہاد وغیرہ ہے۔ البتہ بیشتر نظمیں ایسی ہیں جو اُن نوجوان بانکوں نے خود کہی ہیں جن سے وہ منسوب ہیں۔

عاشقانہ بانکپن میں بی بجر رِند سرِ فہرست ہے۔ اُن کی شاعری ایک بانکے سجیلے میرزادے کی شاعری ہے جو اپنے گھوڑے پر سوار، تلوار اور ڈھال لٹکائے۔ ایران و افغانستان تک کے علاقوں میں گھومتا اور عشق لڑاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ بی بجر کو قندھار میں ایک حسینہ نظر آئی جس کا نام گراں ناز تھا۔ بلوچ اس نام کو مخفف کر کے گرِاناز بولتے ہیں۔ گراناز حاکم قندھار کی کوئی بیگم یا بیٹی تھی جسے آخر کار ایک رات کو بی بجر وہاں سے لے اُڑتا ہے۔ بی بجر نے اس واقعہ سے متعلق ایک خوبصورت نظم کہی ہے اُس میں سے ایک دو اقتباس مُلاحظہ ہوں۔ کہتا ہے ؎

گنگھی گرلان کا نکوں پہ داہے
تا گنگ ءِ پیدا کت اُمل ماہے
منی عاجزیں رُدوج ءُ اشتہ یک داغے۔

یعنی؛

آبادیوں میں گھومتے پھرتے
میں آ رہا تھا
جب ایک دریچے میں
میں نے ایک چاند جیسی اُمل بیٹھی ہوئی دیکھی۔
اُسے دیکھ کر
میری عاجز رُوح سے ایک فریاد نکلی۔

بلوچی کلاسیکی شاعری کی جُستجو کرتے وقت جو مشکل پیش آتی ہے وہ ایک ہی نظم کے کئی بیان یا (VERSIONS) کی صُورت میں ہوتی ہے۔ ہر علاقے کے گُوَیّوں نے اصل نظم کو جس کی شناخت بھی اب ممکن نہیں رہی، اپنی علاقائی بولی میں نہ صرف تبدیل کیا ہُوا ہوتا ہے بلکہ اُس میں اپنی پسند کے مطابق کچھ گھٹایا بڑھایا بھی ہوتا ہے۔

بی بگر کی اسی روایت کو لیجئے ایک جگہ وہ کہتا ہے جیسا کہ اوپر بیان ہُوا ہے کہ آبادیوں میں سے گھومتے پھرتے آ رہا تھا کہ اُس نے گرانا ز کو دیکھا مگر دُوسری نظم میں بیان ہوتا ہے کہ اُس نے بادشاہ کے جیل خانے سے جہاں وہ قید ہُوا تھا اُس نے گرانا ز کو دیکھا اور پھر رہائی حاصل کرنے کے بعد اُسے محل سے لیکر فرار ہو گیا۔

بہرحال یہاں چونکہ ہمارا موضوع بی بگر و گرانا ز کی کہانی بیان کرنا نہیں بلکہ اُس کی شاعری ہے اس لئے قصہ کوتاہ۔ بی بگر اپنی قید خانے والی نظم میں کہتا ہے ؎

گازرءِ کشتیت چہ چھوریں محل ءَ
گازرءِ کشتیت وسّے دلی مان بیت
سکّوا دوست گوں تنگویں بارءَ
کُہیری رند مت چہ گمبریں مارءَ۔

یعنی

وہ (گراناز) محل کے دریچے سے
اپنی گردن باھر نکال کر دیکھتی ہے
وہ گردن باہر نکالتی ہے اور میں اُسے دیکھ لیتا ہوں،
میں اُسے دیکھ لیتا ہوں اور میرا دل اُس پر آجاتا ہے۔

وہ اپنی گردن کے طلائی ہار میں
بہت ہی خوبصورت لگتی تھی۔
اُس کے ریشمان جیسے کالے گیسو
سانپ کی طرح بل کھا کر لٹک رہے تھے۔

بی بگر کس طرح اُس حسینہ کے پاس پہنچتا ہے یہ ایک طویل داستان ہے جسے اپنی کتاب "بلوچستان کی کہانی، شاعروں کی زبانی" میں ہم بالتفصیل بیان کر چکے ہیں۔ یہاں صرف یہ دکھلانا مقصود ہے کہ بلوچ شاعروں نے ایسے واقعات کو کس حد تک اور کس انداز میں بیان کیا ہے۔ الغرض، جب تمام رکاوٹوں سے گذر کر بی بگر گراناز کے پاس محل میں پہنچ جاتا ہے تو پہلے گراناز گھبرا جاتی ہے لیکن تھوڑی دیر بعد بی بگر اپنی شیریں بیانی سے اُسے راضی کر لیتا ہے چنانچہ، کہتا ہے

دم ہمابیت کہ دُردپ ءَ گیدان
دست ءَ من گوں نجی گردنائی گیبان
زرگراں دوست ءَ گنتل و ہار ءَ
بنداں من مماجیں دل ءَ تار،
دُزگرنت سرد دل زہیرا!
تو گ دیاں بریں جادر و جُتّی
دُردت دینت ڈالشاتیں بر دست رکان۔

یعنی:

آن کی آن میں

اُس دُلہن کے پاس پہنچتا ہوں

اُس کی گونج جیسی گردن میں

اپنے بازو حمائل کر دیتا ہوں۔

اُس کی گھونگر یالی زُلفوں کو

اُس کے سینے کے طلائی ہار سے ملا کر

اپنی تنگ آغوش میں بھینچ لیتا ہوں۔

اور اُن سے

اپنے محتاج دل کے ٹوٹے ہوئے تاروں کو

باندھ دیتا ہوں۔

تب ہمارے دردِ فراق سے بیتاب دلوں کو

تسکین حاصل ہوتی ہے۔

پھر ہم دونوں

میری خاکی چادر اور اُس کی چنری اوڑھ لیتے ہیں۔

میری شاندار مونچھیں

اُس کے ہونٹوں کو چومتی ہیں۔

جب کسی دل میں آس کی بجائے یاس اور اُمید کی بجائے نااُمیدی کی کیفیت دا ہوتی ہے تو پریشانی اور بے صبری بڑھ جاتی ہے۔ بی بگر نے اپنی ایک دوسری نظم میں اس فیت کو موثر انداز میں پیش کیا ہے کہتا ہے:-

نئے دوست منیت کہ دوش کناں زرد ء

نئے کہ گنت نا ہے، من باتراتی پہلان۔
مارا، من نیام ءِ گمبلان داشتہ
بُرزی نودان و بارگیں شیکان۔
یعنی،
نہ تو محبوبہ مانتی ہے
کہ میرا دل خوش ہو جائے
اور، نہ اِنکار کرتی ہے
کہ، مَیں اُس کا خیال چھوڑ دُوں۔
بس، مجھے درمیانی فضا میں
آسمان اور گہرے پتلے بادلوں کے درمیان
لٹکا رکھا ہے۔

بی بگر رند، ایک دفعہ رات اپنی کسی محبوبہ کے ہاں بسر کرتا ہے۔ علی الصبح جب اس کی محبوبہ اُسے جگا کر کہتی ہے کہ اُٹھو، صبح ہو گئی، اَب یہاں سے چلنے کی کرو، تو بیبگر اُس سے کہتا ہے کہ محبوباؤں کو چھوڑ کر بھاگنے والا جوان مَیں نہیں ہوُں۔ ملاحظہ ہو کہ شاعر نے کس خوبی اور چابکدستی سے اِس کیفیت کو بیان کیا ہے۔ کہتا ہے:-

درکپیت صُبح ءِ کافریں استار
کپیت چو تیر دوری جلشکان ءَ
آہنگ ءِ جکیت دست ءِ باتبنک ءَ
دُولاں گوں ہوشیں کلاتیبان
دست ءِ چو گنگری بلوڑ مینیت :
پادا، اُٹھ ورنا! کہ آستہ بامی

ماؤ تو ہر دو مرد مُوں نامی ۔

یعنی
صبح کا ظالم ستارہ طلوع ہُوا
اور کمان سے پھینکے ہُوئے تیر کی طرح
چمکتا ہُوا اُوپر کو اُٹھنے لگا ۔
تب اُس (محبُوبہ) نے آہستہ سے
اپنا چوڑیوں سے بھرا
اور ہاتھی دانت کی طرح سفید ہاتھ
میرے سر کے نیچے سے کھینچ لیا ۔
اور گونگوں کی طرح
ہاتھوں سے اشارہ کرتی ہُوئی کہنے لگی ۔

اے نوجوان ! اُٹھ
کہ سپیدۂ سحر نمودار ہُوا ۔
ہم دونوں نیک نام لوگ ہیں
(ایسا نہ ہو کہ بدنام ہو جائیں) ۔

بیبگر کا مدعا بھی یہی تھا کہ دن نکل آئے اور لوگ اُسے دیکھ لیں ۔ اُس کی محبُوبہ کو اُس کا خاوند طلاق دیدے یا پھر میدان میں نکل کر بیبگر کو مار ڈالے یا اُس کے ہاتھوں مارا جائے چنانچہ اپنی محبُوبہ سے بیبگر کہنے لگا :۔

اے نی عاریفیں پیت ءَ ہیل نت
دوست ءَ کلیت دگہ نت لوگ ءَ
من ءَ کنزاں چہ موزئی پیتر ءَ

چو رُدی پد کپنزگ من ءَ عیب اِنت ۔

یعنی؛

(تب میں نے ہنس کر اپنی محبوبہ سے کہا)؛

یہ تو تیرے بزرگوار باپ کی عادت ہے

جو محبوبہ کو چھوڑ کر

گھر سے نکل بھاگتا ہے۔

ہم تو اپنے پاؤں کی ایڑی بھی

پیچھے نہیں ہٹائیں گے ۔

بھُو کروں بطرح (محبوبہ سے) پیچھے ہٹنا

ہمارے لیے عیب کی بات ہے ۔

بیبگر، بلوچی کا ایک بُلبلِ ہزار داستان ہے اس کی ہر داستان

اپنے اندر ایک اور معنی بھی پوشیدہ رکھتی ہے جسے ہم اُس کی خُوب سے خُوب تر کی تلاش کہہ

ہیں۔ اس کی بعض داستانیں جیساکہ اُوپر بیان کی ہوئی داستان ہے محض انتقامیہ میں لیکن

داستانیں عاشقانہ بانکپن اور ہمعصر نوجوانوں کو دعوتِ مبارزت پر منتج ہیں مگر چونکہ یہاں

داستانوں کا ذکر چھیڑنے سے ہمارا مقصد اُن کی تفصیلات بیان کرنا نہیں بلکہ بیبگر کی ش

صلاحیت کو اُجاگر کرنا ہے اس لئے تفصیلی بحث میں ہم نہیں پڑتے صرف اُن اشعار کو لی

جو ہمارے موضوع سے قریب تر ہیں۔

بی بگر، اِن دنوں غالباً شوران[1] کے قریب فتحپور[2] کے قلعہ میں م

کے ساتھ رہتا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے کہ اُسے بستی سے اُس کی محبوبہ کا پیغام ملا۔ کہتا

---

[1] کچھی میں سردار رند کا علاقہ اور گاؤں ۔ الخ

[2] شوران اور [illegible] کے درمیان واقع میر چاکر کا پرانا قلعہ جو اب منہدم ہو

پیگام انگنت دُر چیڑ ءَ

ہنبوں میں سلام ءِ تئے دوست ءَ

بیا پہ یک شپے شگبیر ءَ۔

یعنی،

اُس موتی بکھیرنے والی محبوبہ کا پیغام آیا

اُس دور اُفتادہ محبوبہ کا

خوشبوؤں میں بسا ہوا سلام پہنچا

کہ ایک رات کے لئے

شبگیر مار کر ضرور آجاؤ۔

محبوبہ کا پیغام پاکر بیبرگ کہتا ہے کہ میں نے خیال کیا کہ :ـ

سیبی دیرنت ورو چ گرمنت

بور ءِ مئے لوار سوچیت

جنذ مئے بیدھاں تُنّی بیت۔

یعنی،

سبی دُور ہے

اور دِن بھی بہت گرم ہے

میرے گھوڑے کو لُو لگ جائے گی

اور خُود مجھے بھی ویرانوں میں پیاس لگے گی۔

لیکن اِس کے باوجُود وہ رُک نہ سکا، گرمی کی شدت اور پیاس کی تکلیف کی پرواہ کئے

بغیر وہ چل پڑا۔ لیکن کہتا ہے کہ رَوانگی سے قبل میں نے :ـ

سردار سورتہ سُگّانی

چاکر ! تو منی گوانک ءِ بیا

بور ءِ آسنیں پادان دے

مُرگھی بانزران زَرّ بیناں

مارا داں ہمو داں سر کن -

یعنی،

میں نے اپنے اُولوالعزم سردار کو یاد کیا

اے چاکر ! میری مدد کو آجا ،

میرے گھوڑے کو لوہے کے پاؤں

اور پرندوں کے چاندی جیسے سفید پر دیدے

مجھے وہاں تک پہنچا دے -

ایک دفعہ بی بگر بھیس بدل کر کسی گاؤں میں جاتا ہے، جہاں ایک حسینہ پہلے سے اُس کی نظروں میں ہوتی ہے - بالآخر دو تین دن اس گاؤں میں گانے بجانے کے بعد اُس حسینہ تک رسائی حاصل کر لیتا ہے. صبح کو اُس حسینہ سے اپنے رخصت ہونے کا بیان اس طرح کرتا ہے. کہتا ہے :-

چاڑمی پاس ءِ مُلّائی بانگ ءِ

گل من ءِ تو ہینتہ پرے وہم ءِ

بادا اُو ہیکہ کہ آسنہ بائم

اَرگتیں ڈَی نیں کانت پہ آس ءَ

چلیم ءِ و ز یرنت تمباک ءِ

مارا گِندانت تئی چادر ءِ چیر ءِ

تئی نوا ڈیل ءِ دا بُدرو ہبنت -

Scanned with CamScanner

وَست ءِ من گُونچی گردنانی شپیتین
وَلے چہ ہیر واریں دپ ءَ گپتین ۔

یعنی)

رات کے چوتھے پہر
مُلاّ کی اذان کے وقت
اُس گلرنگ نے مجھے یہ کہہ کر جگایا
اُٹھ، لے بی بگر! صُبح کی روشنی پھیل گئی
بُدھی عورتیں اب تھوڑی دیر میں
آگ لینے کو آئیں گی ۔
چلم کے لئے تمبا کو لے جائیں گی
جب وہ تمہیں میری چادر کے نیچے دیکھیں گی
تو ممکن ہے کہ شور مچا کر
تم کو کوئی نقصان پہنچا دیں ۔
مَیں نے اپنے دونوں بازو
اُس کی کُونج کی سی گردن میں حمائل کر دیئے
اور اُس کے اِلائچی کھانے والے مُنہ کو چُوم لیا ۔

ایک رات بی بگر اپنی ایک دوست کو اطلاع دیئے بغیر اُس کے خیمے میں چلا جاتا ہے، دُوسرے دن اِس واقعہ کو بیان کرتے ہُوئے کہتا ہے :ے

دوست مے زیتگ و داب بِیتہ
گیتوں جمبو ءَ راستین ءَ
گلیت دریگاں چکّی ءَ

چہ بلیت خماریں چمان
دست ۔ مں رلی ایرہ آران ۔

یعنی!

میری محبوبہ سوئی ہوئی تھی
میں نے جا کر اُس کے داہیں ہاتھ کا
پنجہ پکڑ لیا ۔
وہ بچے کی طرح گھبرا کر نیند سے جاگی ۔
اُس کی پُر خمار آنکھیں
گھبراہٹ میں کھل گئیں
میں نے اپنا ہاتھ
اُس کے دل پر رکھ دیا ۔

ایک اور حسینہ کے پیچھے پیچھے بہت سرگردان رہتا تھا ۔ آخر ایک دن جب وہ شکار سے واپس آرہا ہوتا ہے کہ اثنائے راہ میں اُس حسینہ کی طرف سے قاصد آکر اُسے اطلاع دیتا ہے کہ :ـ

بیا، ترا موکل ہستہ مں بوپ ءُ
من لہیپ ءُ ورنگیں توک ءُ
شپ تئی اِنت در دج بہ ریانی ۔

یعنی!

اے بی کبر! آجا
کہ تجھے نرم گدیلے پر سونے
اور ریشمی رضائی کے اندر آنے کی

اجازت مل گئی ہے۔

اَب راتیں تیری ہیں

اَور دن تیرے دشمنوں کے۔

حمَل ۔ ساحلی علاقے میں رہنے والی کلمتی ہوت بلوچوں کے سردار جیند کا بیٹا تھا۔ اِس لئے حمَل جیند کہلاتا ہے۔ بڑا عاشق مزاج اور بہادر نوجوان تھا۔ پرتگیزی بحری قزاقوں کے خلاف لڑائی میں مارا گیا۔ روایت ہے کہ حمل جیند ایک دفعہ اپنی محبوبہ سے ملنے کی بیلہ جا رہا تھا۔ رات کا وقت تھا، راستے میں ایک شیر سے اُس کا مقابلہ ہوا۔ شیر کو مار ڈالنے کے بعد اُسے ستاروں کو دیکھ کر یہ احساس ہوا کہ رات نکل گئی ہے اور وہ ابتک بیلہ سے دُور ہے۔ کہتا ہے :-

شپ کسان اِنت و بانگ دنت مُلّا

شپ کسان اِنت دچون کنت اَللہ

دیر نت منی مہر ہنگ من گور گیں کُھل ءَ۔

یعنی؛

رات کم باقی رہ گئی ہے

مُلّا اذان دینے والا ہے۔

رات کم باقی رہ گئی ہے

نہ جانے خُدا کو کیا منظور ہے۔

میری مہوش ابتک

اپنے سفید خیمے میں بہت دُور ہے۔

تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو مصنف کی بلوچی منظوم داستان حمَل جیند ۔ الخ

Scanned with CamScanner

بہ ہر حال، حمل شیر کے دونوں پنجے کاٹ کر جب اپنے مُشکی گھوڑے کو ایڑ لگاتا ہے تو آن کی آن میں اپنی محبوبہ کے خیمے میں پہنچ جاتا ہے اور اُس کی محبوبہ :-

رُتّب کُت چو مُرگان ہوا ئیان
گردوں گردیت گوں دُرّ و بانہیان۔

یعنی

وہ ہوا میں اُڑنے والے پرندوں کی طرح
جھپٹ پڑی
اپنی چُوڑیوں کو کھنکھناتی
اور بالیوں کو لہراتی
میرے چاروں طرف گھومنے
اور بلائیں لینے لگی۔

حمل نے جب اپنی محبوبہ کو شیر کے ساتھ اپنی لڑائی کا حال سنایا تو وہ بیتاب ہو گئی۔ حمل کہتا ہے :-

دستی گوں بانزگاں روگنت پُرزا
جنتی پمبا چینی کا گھدیں دیمءَ
جُہل تنا سرزاناں پہ سیر گیں
ہورے من باتاں گوں بدیں کارءَ
گردوں در روُت گوں گوترءِ بارءَ
پچُشیں شیوازاں ترا گیھتگ
نیم شپی بے وہداں ترا مشتگ
دوستوں، انبازءَ من وَتی گیپتگ۔

یعنی

اُس نے اپنے چوڑیوں بھرے دونوں ہاتھ

اُوپر کو اُٹھائے

اور اُنہیں اپنے کاغذ جیسے سفید چہرے پر

اور اپنی پنیر جیسی سفید رانوں پہ

مار کر کہنے لگی :

ہائے ، مَیں مر جاؤں !

کیا بُرا کام میں نے کیا

کہ تم کو ایک ایسی آزمائش میں ڈال دیا۔

اور آدھی رات کو

تمہیں ایسی مصیبت میں پھنسا دیا۔

مَیں نے محبوبہ کو

اپنی آغوش میں لے لیا۔

شئے مُرید ، ہانی کے عشق میں دُنیا کو ترک کر کے مکہ معظمہ چلا گیا۔ کئی سال
ں رہنے کے بعد جب واپس آیا تو ہانی نے اُس سے ملنے کی خواہش کی مگر شئے مُرید نے
ب دیا کہ : ؎

آتیر کہ من پیشں ءَ جنگ

نیں پہ تئی ءَ گار کنگ۔

مردی ءُ مرد کاری نہیان

پر دوُر داں، سواری نہیان

عشق ءَ تئی ءَ نہنگ گان

Scanned with CamScanner

جان ءِ سل ءَ پیلو شتگان
بند بند وتی داگھ داتگان ۔
یعنی

(عشق کے) وہ تیر جو میں پہلے چلایا کرتا تھا
وہ اب تیرے فراق میں کھو چکا ہوں ۔
اب نہ تو میں مرد ہوں
اور نہ ہی کوئی مردانہ کام کر سکتا ہوں
اب میں رکاب میں پاؤں ڈال کر
گھوڑے پر سوار ہونے کے قابل نہیں ہوں ۔
تیرے عشق میں جل چکا ہوں ۔
اپنی کھال جلا چکا ہوں
اور اپنے جسم کے
ہر ایک جوڑ پر داغ دے چکا ہوں ۔

شے مُرید، ہانی کے عشق میں تقریباً دیوانہ ہو چکا تھا ۔ وہ راتوں کو میر چاکر کے قلعے کے گرد گھومتا اور ہانی کے عشق میں پُرسوز اشعار گایا کرتا تھا ۔ ہانی کو مُرید کی یہ حرکتیں پسند نہیں اِس لئے ہانی نے اُسے ایک دفعہ پیغام بھیجا کہ وہ اِس طرح راتوں کو گھوم پھر کر اُسے بدنام نہ کیا کرے ۔ شے مُرید نے اُسے جو جواب دیا وہ قابلِ غور ہے ۔ کہتا ہے :ـ

ہانی ! من ءَ تیراں مجن
شلّیں نہان من ڈوبر ءَ
لے رنگ مئی ساہ نہ روت ۔
زیر تو وتی جود ءِ تگ ءَ

براتءِ دو گوشیں حنجرءَ
شل ؤُرے منی پاگیں شُشءَ
ہر دو کشان پاد گور زیت
حون پہ مُلکتانءَ رِچّنت
پاک کن گوں شادیں پلّوءَ
دست گوں زباد و سنگوران
حنّی رِجیں مورد انگان
لیٹان ہما ہندءَ کپان
ہانی ! تنی کُہلءِ ڈپءَ۔
مُنّی کہ بیانت دسگہار
اُشتو ہمے پولءَ کنت :
”نشتے سنگریں سکےءَ جنگ
کشءِ بدیءَ، آنہ تت“۔
”اُشں وت مشیارءَ دیر کنے
تنے پہ شپانی چرگءَ
مارگوں مشیارءَ پلّنگ
میر چاکرءِ بورءَ جنگ“۔
یعنی؛
ہانی! مجھے ایسے تیر نہ مارا کرو
ایسے نوکدار مم میرے سینے میں مت گھونپو۔
اس طرح میری جان نہیں جائے گی۔

اپنے خاوند کی کمان اٹھا لو
یا، اپنے بھائی کا دو دھارا خنجر لے لو
اور اُسے میرے پہلو میں گھونپ دو۔
ایسا کہ، دونوں طرف سے پار نکل جائے
میرا خون جب اُبل اُبل کر بہنے لگے
تو اپنے ریشمی دوپٹہ کے پلو سے
اپنے زباد بیز اور کنگن پہنے ہاتھوں
اور اپنی مہندی لگاتی ہوئی انگلیوں سے
میرا خون صاف کر لینا
ہاں! میں وہاں پر ہی
تیرے خیمے کے دروازے کے سامنے
گر کر، تڑپتا رہوں گا
صبح کو جب تیری سہیلیاں آئیں
اور تم سے پوچھیں۔
کہ، اس غیور درویش کو کس نے مارا
یہ تو کسی کا بدخواہ نہیں تھا"۔
تو تم اپنے کو اس الزام سے دور رکھنا
اور کہہ دینا کہ
اس درویش نے راتوں کے گھومنے پھرنے سے
ہم کو بدنام کر رکھا تھا
رات اٹھے

Scanned with CamScanner

میر چاکر کے بور گھوڑے نے مار دیا ہے۔

مُلاّ فاضل رِند کی بعض نظمیں سابقہ اَدوار کے بلوچی شاعروں کی سلاست اور سادگی کے برعکس مشکل، ذومعنی اور بسا اوقات مُعمّا جات کی حدود کو چھو لیتی ہیں۔ اس کے باوجود، مُلاّ فاضل رند دورِ متاخرین کے بلوچی شعراء میں ایک بلند مقام رکھتا ہے کیونکہ اس دور میں مشکل گوئی کو شاعری کی معراج سمجھا جاتا تھا جس میں مُلاّ فاضل واقعی لاثانی تھا۔

دورِ متاخرین کے مُلاّ شاعروں نے اپنے عشق و عاشقی کی جو داستانیں نظم کی ہیں اُن کی مثال ایسی ہے جیسے صوفی شعراء اپنے کلام میں جام و شراب اور ساقی و میخانہ کا ذکر کیا کرتے ہیں۔ مُلاّ فاضل نے ایسی پیچیدہ نظمیں بھی کہی ہیں جن کے معنی عام قاری کی سمجھ سے بالاتر ہیں۔

مثلاً اپنی ایک نظم میں کہتا ہے :—

ذی شکاراں پہ سوغنی آپ بنداں
صورتی ، دل گیرین جگر بنداں
کئیپ جرڈی بتینت گوں من وھبگاں
داتگ من ءَ سرا پہ گنوک رنگاں
گرینگیں کاراں چہ بازیں دل تنگاں۔

ہر تہ رگو ھیپ ہاترءَ پلّاں
مرکبی گمراہیں دل ءَ خلّاں
شوری دار تنگ چہ گوات جتیں ملّاں
سراپ گناں انت چہ گوہرین تلّاں
دیم ماں باگھءَ سر پنگیں پھلاں
من حیالانی رو نہوی نہلّاں۔

یعنی؛

کل میں شکار کے لئے
پانی کے خوبصورت بندات[1] کی طرف گیا۔
جو بہت ہی دل لبھانے والے
اور جگر کو چاک کرنیوالے ہوتے ہیں۔
مجھ پر کیف ومستی کی ایک ایسی کیفیت طاری ہوگئی
جیسے مَیں نے بھنگ پی ہو۔
ہائے! اُن پاگل کر دینے والی حسیناؤں نے
مجھے چکرا دیا ہے۔
اور مَیں اُنہی کی ہوئی حرکتوں پر
سخت نادم ہُوں۔
اب بھی جس قدر میں اپنی پتھر کیطرح سخت طبیعت کو
سنبھالتا ہُوں
اور بدمست گھوڑے کی طرح بدکے ہُوئے
اپنے دل کو
جو چراگاہوں میں ہوا کے تُند جھونکوں سے
جھُومنے والے گھاس کیطرح چلبلا رہا ہے
روکتا ہوں
مگر وہ نہیں رُکتا
اور پہاڑیوں کی چوٹیوں پر سے چھُپتے چھُپاتے

---

[1] پانی کے بند جو ندیوں پر باندھے جاتے ہیں۔ اھ

دریدہ باغ میں کھلے ہوئے
اُس پھول کی طرف مائل ہو رہا ہے
جس کی یادوں کے طوفان سے
میں نکل نہیں سکتا۔

ایک اور نظم میں مُلّا فاضل اپنی محبوبہ کا تعارف اس طرح کراتا ہے :-

شپ چراگھ ہلنج، اچ وتی خویشان
شذر و مرجانش است من گوشان
شہرگران انت گوں زرگری ہوشان
نہ بیتگیں من دیدارے برا موشان۔

یعنی؛

وہ لعل شب چراغ
وہ ماہِ شب تار
جس کے کانوں کے جھمکوں میں،
جو سُنار نے خاص طور پر بنائے ہیں
شذر و مرجان کے نگینے دمک رہے ہیں
وہ میرے خویش و اقارب میں سے ہے۔
میں اُس کے دیدار کو
ہرگز فراموش نہیں کر سکتا۔

مُلّا فاضل کو اپنی قبائلی عصبیت پر فخر ہے اور دلیل کے طور پر اُسے اپنی محبوبہ کے سامنے اس لئے پیش کرتا ہے کہ وہ اُسے بڑا آدمی سمجھ کر اُسے قبول کرلے۔ اس لئے کہتا ہے :-

جی منی ڈیل ءُ ہمدلیں وت میاد

تو پہ من صید و من پہ تو صیاد
تو پہ من شیرین من پہ تو فرہاد
خاص منان میرین چاکرءِ اولاد
نازمنی بالاد ءُ کمن شمشاد -

یعنی)

اے میری عزیز محبوبہ !
تُو میرا شکار
اور مَیں تیرا شکاری ہُوں -
تُو میری شیرین
اور میں تیرا فرہاد ہُوں -
مَیں، خاص میر چاکر کی اولاد ہُوں
اس لئے اے میری شمشاد قد محبُوبہ !
مجھے مت ٹھکرا -

مُلّا فاضل کی بعض نظمیں بیبگر رند کی پیروی میں ہیں۔ مگر کہ بیبگر کی طرح عملی نہیں، صرف دل بہلاوے کی باتیں ہیں لیکن مُلّا فاضل اپنے اشعار میں محبُوبہ کے پاس جانے کی تیاری کا جو سماں پیش کرتا ہے وہ بیبگر کی طرح کے ایک بانکے نوجوان کے مُناسب حال ہے چنانچہ کہتا ہے:

پادا. اُوْ ورنا ! مست دبے سارین !
آنخت تئی دَراہی، دیرت گُت بادین
سرین وتی بستان رندی ڈوّل دارین
چرحل و جیبگرءَ - کوچ ءُ زرکارین -

نوکراں آورتہ بور وکاب بالین
ایرش گُرت و نگالی زین ہرات کارین
زامُرون اُڈّ دات من گُڑی جیارین
دُوروان دِرنگ بُو بجتوں بیدارین
حملھوں گجھت پہ شپ ء تارین۔

یعنی؛

(میرے دل نے مجھ سے کہا:)
اَے مست و مدہوش نوجوان! اُٹھ
کہ محبوبہ کے پاس تیرے جانے کا
مقررہ وقت آگیا۔
میں نے اُٹھ کر
رِندوں کی طرح اپنی طرحدار کمر کس لی۔
حمل (جیئند) اور بیبگر (رند) کی طرح
اپنی زرکار تلوار دوش پر لٹکا دی۔
نوکروں نے میرا اعقاب بال گھوڑا باہر نکالا
اُس کی پیٹھ پر ہراتی ساخت کی زین ڈال دی
پاؤں میں مہمیز پہن کر
میں نے اپنی ایڑیاں چار کر دیں۔
میرا بخت جو بیدار تھا
وہ میرے ساتھ رکابوں پر جھول گیا
اور میں اندھیری رات میں

(کوئے جاناں کیطرف) جھپٹ پڑا۔

اپنے عشق و عاشقی کی ایسی فرضی داستانیں سُنانے اور نوجوان سامعین کو اُن سے لطف اندوز کرانے کے بعد شاعر فاضل کی بالآخر مُلّائی رگ پھڑک گئی ہے تب وہ ایک ناصح مشفق بن کر نوجوانوں کو ایسی لااُبالی حرکتوں سے منع کرتا ہے، کہتا ہے:

کج کجے بیت کہ چار دہی ماہے
دت تو اُدراہی ءَ بدخت جاہے
دراج مکن گام گیجان پہ راہے
صد شپ ءَ یک شپ تو کپے چاہے
چو تو در پیش بیت، دست بدواہے
تو ہزار افسوس ءَ ورے زندء
پرشنگیں دست اچ نہینت بیدا نبدء۔

(یعنی)

اگر وہ خوبصورت عورت
انتہائی خوبصورت ہو،
جیسا کہ چودھویں کا چاند
اور اُس نے خود تم کو
دعوت دے کر بلایا ہو
تب بھی
اُس کیطرف جانے والے راستے پر
اپنے قدم ہرگز آگے نہ بڑھانا
سوراتوں میں سے ایک رات

Scanned with CamScanner

تُم ضرور کسی کنوئیں میں جا گرو گے
پھر تیرا کاکل اور تیری داڑھی
دشمن کے ہاتھ میں ہو گی
یہ میں تم ضرور پچھتاؤ گے
مگر، ٹوٹے ہوئے ہاتھ (کی ہڈی)
پھر کبھی برابر نہیں جُڑے گی۔

ملک دینار عبدالکریم بیٹرانی نے بھی اسی قسم کی عشقیہ نظمیں لکھی ہیں لیکن اُس نے عشق بازی اور بدکاری کے درمیان ایک حدِ فاصل قائم رکھی ہے۔

ایک دفعہ ملک دینار سفر سے واپس آ رہا تھا۔ منگلی پہنچ کر اُس نے اپنی محبوبہ کو جو اُس کی بیگم بھی تھی اپنی آمد کی اطلاع بھیجی۔ انداز بیان ملاحظہ ہو۔ کہتا ہے:

چھتی شپ داراں منگلی شہرء
نود پروت مستاگی بدنت آرا
آمتی ہمہ اتیں گران سال ء
شور دبیں گراہیں و کلاب بال ء
زرتگ و میدان انت چہار نال ء
بے ڈُھی بادگیر، سبزی تاک ء
گوات گرء معلیخ نشتہ بیو آک ء۔

یعنی:

کچھ راتیں ہم منگلی کے شہر میں گزاریں گے
تاکہ بادل جا کر
ہماری ہجر زدہ اور کم سن محبوبہ کو

Scanned with CamScanner

ہمارے آنے کی خوش خبری سنا دیں۔

پھر ایک رات کو
ہم اپنے شوخ اور عقاب بال گھوڑے کو ایڑ لگائیں
ہمارا چار نعل (گھوڑا) اُچھلتا، کودتا
اور سرپٹ دوڑتا ہوا جائے۔
کسی کو اطلاع دیئے بغیر ہم اپنے گھر پہنچیں
اور اُوپر کی منزل پر
آہستہ سے چڑھ کر دیکھیں
وہ مہلنج مغموم صورت بنائے
ہمارے انتظار میں بیٹھی ہوئی ہوگی۔

عشق و عاشقی کی باتیں تو صرف عاشقوں کو زیب دیتی ہیں یا اُن بانکے نوجوانوں کو جو سر ہتھیلی پر رکھ کر یہ شغل کیا کرتے ہیں۔ یہ مُلاؤں اور ناصحوں کے بس کی باتیں نہیں ہوتیں۔ جس دل میں درد نہ ہو، جن آنکھوں میں آنسو نہ بھر آئیں اور جس سر میں عشق کا سودا نہ ہو وہ اس منزل کا راہی نہیں بن سکتا۔ اگر بننے کی کوشش کرتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ ایک زاہد پشمینہ پوش رندان بادہ خوار کی محفل میں جا بیٹھا ہو اور ہدف طنز و مزاح بن رہا ہو۔

بلوچی کے بانکے شاعروں نے سلیس اور سادہ زبان میں جو واردات بیان کی ہیں کسی مُلائی عالمانہ گفتار اُن کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ مثال کے طور پر سحاک رند کے اس واقعہ کو لیجیے، کہتا ہے:-

کماکان دی گُنی جوڑ و گھیران
مہلنج من ڈورانی ھسر دیستہ
مارا پہ دُروشتانی گُشتی اُدا

زہیرءِ وارتاں کہ اُرجاں ہندی

ڈالوں دا مبلنجءِ کلائیءَ :

تھامہ تراز ہمرانت مں سرءَ سایا ؟

کہ ماثریں یاراںءِ کنئے آذا ۔

یعنی

میں بھی گنجی کے رہگذر پر سے آرہا تھا

کہ میں نے مہلنج کو

ندی کے کنارے دیکھا

اُس نے دیکھتے ہی

مجھے بھائی کہہ کر خوش آمدید کہا

میں زہر کا یہ پیالہ نہیں پی سکا

جھٹ اپنی ہندی تلوار کھینچ کر

مہلنج کی کلائی پہ دے ماری ۔

اور پھر میں نے اُس سے پوچھا کہ

کس کی تلوار کا تجھ پہ سایہ ہے

کہ یار کو اُس کے رُوبرو بھائی کہنے کی

جُرأت کرتی ہو ۔

سحاک رند کی محبوبہ جب کٹی ہُوئی کلائی لیکر گھر پہنچتی ہے تو اُس کی سہیلیاں

اُس سے پوچھتی ہیں کہ اُس کی کلائی کیسے کٹی ۔ تو جواب دیتی ہے کہ

رہیتہ منی دوست ءِ تیگءِ خوراسانی

گوڈ تہ منی راستیں پنجہ کلائی ۔

یعنی،

میرے محبوب کی خراسانی تلوار

اچانک مجھ پر گری

اور میرے کام کا دایاں پنجہ کاٹ دیا۔

سہاگ رزنڈ کی محبوبہ نے اس بہانے سے اپنی سہیلیوں کو ٹال دیا لیکن اُس کو معلوم تھا کہ یہ واقعہ زیادہ دنوں تک راز میں نہیں رہ سکے گا۔ اس کے بھائی بند اور رشتہ دار اُس سے ضرور پوچھ گچھ کریں گے اور رسوائی ہو گی۔ اس لئے اُس نے فیصلہ کیا کہ: ۔

من وتی ہزراں ءَ نہ شرمایاں

بوجاں وتی کھل ءِ نیامگی جوڑءِ

بنداں گوں دراج داراں کڑتیگاں

پچیری ہار ءُ ونّشتی گمنڈی ءَ

تنگویں طوقاتی بلنڈی ءَ

ساہ ءَ پہ بیگی ہیرتے کشاں۔

یعنی،

میں (اب زندہ رہ کر)

اپنے محرموں کو نہیں شرماؤں گی۔

اپنے خیمے کے درمیان کا طناب کھول کر

اُسے درمیان کی لمبی لکڑی کی کڑی میں ڈال دوں گی۔

اور پھر اُسے اپنے گلے میں

ہار کے نیچے سے اور گلوبند کے نیچے سے طوق کی طرح

بلندی پر کھڑی ہو کر

پہن لوں گی ۔
اور اُس سے لٹک کر
ہانپتے، کانپتے کُتیا کی موت مروں گی ۔

پیر بخش بانگ بھگڑی، ایک رات اپنی محبوبہ سے ملنے کو اُس کے گاؤں میں
جاتا ہے کہتا ہے: ؎

ریچکاں وراں ب، اُنگیگ
نین کہ اں ہلکانی بروء، کہ یان
شپ چراگے کہ ؤپتہ من بہ پان
شپ چراگے کہ چار دہی ملتے
چار دہی ماہتے کہ بامی اِستناہے ۔
دوست منی پچھتے کہ کس نہ موڑینتہ
ستہ میں قولی ء نہ شُشتیتہ ۔

یعنی:
میں اُس سے کئے ہُوئے وعدے کے مُطابق
وہاں پہنچا
جب میں گھروں کی قطار میں سے گزرا
تو مَیں نے دیکھا
کہ ایک لعلِ شب چراغ
نرم گدوں پر سوئی ہُوئی ہے ۔
مَیں حیران ہُوا
کہ یہ لعلِ شب چراغ ہے یا چودھویں کا چاند

چودھویں کا چاند ہے کہ صبح کا روشن ستارہ۔

میری محبوبہ، ایک ایسا مچُول ہے

جسے اب تک کسی نے مَسلا نہیں

یہاں تک کہ

اُس کا نامدار شوہر بھی اُسے کھولا نہیں سکا ہے۔

کیا اور صدو کی داستانِ عشق، بہت مشہور ہے، ایک دن صدو ایک طوطی پکڑ کر لاتی ہے اور اُسے کھلا پلا کر رام کرتی ہے کہ کسی دن اسے قاصد بنا کر اپنے محبوب کیا کے پاس باہو بھیج دے گی۔ جب طوطی پوری طرح بولنے لگتی ہے تو ایک دن صدو اس سے کہتی ہے:

طوطی نلی! طوطی نلی!

طوطی نلی، روش رنگین!

ہر دینکہ مشاہت پی رُوگ

کُوکُو کَن، وڈاہ دَے منءَ

ٹکے نشانہت من دیان:

ٹکے کہ نامی باہُو انت

بھوتے کہ مان انت ویرین

آپے کہ مان انت زمزمین

گلے کہ مان انت گردگین

مرٹے کہ مان انت پھل گدین

شہ پھل گدان، پھل گد ترین

سرین جالوءَ بارگ کتہ

کونگ چرڈ گین اسپرءَ۔

یعنی؎

اے ندیوں کی طوطی ! اے ندیوں کی طوطی !

اب تم اچھی طرح سدھائی گئی ہو،

جب تمہارا جی، جانے کو چاہے

تُو کُوکُو کی صدا لگا کر

مجھے اطلاع دے دو۔

میں تم کو ایک ایسے مُلک بھیجوں گی

جس کا نام باہو ہے۔

جس میں ایک لمبی پہاڑی ندی بہتی ہے

جس کا پانی آبِ زمزم کی مانند ہے

جس میں اُونٹوں کا ایک مُدوّر گلہ چرتا ہے

جہاں ایک ایسا خوش پوش شخص رہتا ہے

جو خوش پوشوں میں بھی خوش پوش ترین ہے۔

جس کی کمر ترکش نے پتلی

اور دوش کو مضبوط ڈھال نے

سخت کر دیا ہے۔

صدو، آگے چل کر اسی نظم میں طوطی سے کہتی ہے کہ جب تم باہو پہنچ کر اُس شخص کو جس کی تعریف کی گئی ہے دیکھ لو، تب ؎

کُوکُو کن و پاگاتی بندِ

مں چوٹیں باشکاتی بگہ

گُستا چہ جیلانی بجہ

وش وش من گو شانی بگوش

پیغام مہ وتی آرتگان ۔

یعنی،

ٹو ٹو کی صدا لگا کر

اُس کی پگڑی پر بیٹھ جاؤ

اور اپنی منقار سے اُس کا بازو پکڑ لو

ساتھیوں سے اُسے علیٰحدہ لے جاؤ

اور آہستہ سے اُس کی کان میں کہہ :

"میں صدو کا پیغام لائی ہوں"

صدو کہتی ہے کہ جب کیا اپنے ساتھیوں سے علیٰحدہ ہو کر تیری بات سُننا چاہے

تب اُسے میرا پیغام سُنا دو اور کہو کہ صدو کہتی ہے :ے

اَچ من ترا دوستے گرِنت

اَچ من گہہ وگہتر ترِنت

پہ مہذب و سنگین ترنت

ہزبی فوی وجسترِنت

نا کوئی پھُلیں گیشترنت

میشی ھزار دہنج سُدنت

ٹوک زنگیں ماد گ یکصدنت

بگِش گجین دبز ترِنت ۔

یعنی،

کیا مجھ سے بھی اچھی

کسی اور حسینہ پر تیرا دل آ گیا ہے ۔

کیا وہ مجھ سے زیادہ حسین اور بہتر ہے

مجھ سے بھی زیادہ مہذب اور شائستہ ہے

یا اُس کے بھائی بہت طاقت ور اور بڑے آدمی ہیں

اُس کے چچا اور ماموں تعداد میں زیادہ

اور توانا لوگ ہیں۔

یا اُس کی بھیڑیں ہزار اور پانچ سو ہیں

دُودھ دینے والی گائیں ایک سو ہیں

اور اُونٹوں کے گلّے زیادہ اور بہتر ہیں۔

قصہ مختصر طوطی نے جا کر کیا کو صدو کا پیغام پہنچا دیا۔ کیا ہشلنگ نامی اپنی تیز رفتار اونٹنی پر بیٹھ کر اسی وقت بادِ ہوسے روانہ ہوا۔ راتوں رات گوادر، کاروات، پسنی اور کلمت سے ہوتا ہوا سبیلہ پہنچ گیا۔ رات کا پچھلا پہر تھا، گاؤں کے لوگ آرام سے اپنے گھروں میں محوِ خواب تھے۔ کیا جب صدو کے خیمے میں داخل ہوا تو دیکھ کر: ؎

داب اِنت صدو مُحِل کھندگین

مُن شیشمؤ کٹ ءُ سرءَ

مِن ہیوت ءُ یادی کنان

پچکانی آگاہ نہ بیت

لیٹش دیاں آگاہ نہ بیت

پہ چگلوں آگاہ بیت۔

یعنی)

صدو، وہ گُلِ خنداں

شیشم کے پلنگ پر سوئی ہُوئی ہے
میں آہستہ سے اُسے جگانا چاہتا ہُوں
اُسے اپنی طرف کھینچتا ہوں
وہ نہیں جاگتی
اُسے ایک پہلو سے دُوسرے پہلو پر لٹاتا ہوں
وہ نہیں جاگتی
مگر، جب اُس کا بوسہ لیتا ہوں
تو جاگ اُٹھتی ہے۔

صدّو، کیا سے گلہ کرتی ہے کہ اُسے اطلاع دیئے بغیر چوروں کی طرح وہ کیوں آیا۔ اگر اُسے اطلاع ہوتی تو وہ بناؤ سنگھار کر کے اور عطر وزیادہ سے معطر ہو کر اُس کا استقبال کرتی۔ کیا اُسے دو لفظوں میں جواب دیتا ہے۔ کہتا ہے ۔

ہرکس گوں بو و عنترُ ان
تیلاں قبولے تو من ءَ۔

یعنی"
دُوسروں کو، ممکن ہے تُم
خُوشبوؤں اور عطریات میں بسی ہُوئی
اچھی لگتی ہو
لیکن مجھے
تو تُم (سرسوں کے) تیل کی بُو کے ساتھ بھی
قبول ہو۔

عزت اللہ جگوری بڑا نامور شاعر اور عاشق گذرا ہے۔ اُس نے

اپنی محبوبہ مہرک کے عشق میں کئی پُرسوز نظمیں کہی ہیں۔ ایک نظم میں اپنے دائیں ہاتھ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے :-

جی مَنی راستیں دست مرِّ ایانی
دائم ءِ سر جاہے جنکّانی
سینہ تئی بالشت اِنت پریانی
اشرفی داتغو پرنگانی
چوڑوں چنڈ یتغوں اُنلانی۔

یعنی

جی، تم کو
اے میرا انگبند جو حصوں والا دایاں ہاتھ!
تم ہمیشہ لڑکیوں کے بالیں بنتے رہے ہو،
اور تیری چھاتی حسیناؤں کا تکیہ رہا ہے
تیری ہی برکت سے
میں نے فرنگیوں کی بہت سی اشرفیاں (پونڈ) لوٹیں۔
اور انمول حسیناؤں کے
عشق میں لٹا دیں۔

بلوچستان کے اُس حصّے میں جو آج کل ایرانی بلوچستان کہلاتا ہے
ا پر بولی کا سترن نامی ایک مشہور ہندو شاعر گذرا ہے۔ غالباً وہ باہو کے علاقے کا
تھا۔ شاعروں کی دُنیا میں سترن گنگور کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں پر اِس امر کی تفصیلات
بانے کی ضرورت نہیں کہ بلوچستان کے ہر حصّے میں ہندو زمانہ قدیم سے آباد چلے
ہیں وہ مذہب کے علاوہ رسم و رواج، خوراک و پوشاک اور گفتار و کردار میں بلوچوں

Scanned with CamScanner

جیسے ہی نہیں بلکہ بلوچ ہیں۔ ان ہی قدیم تلدار[1] ہندوؤں میں سے ستدن گنڈر ایک شاعر تھا۔ ستدن گنڈر کی محبوبہ اُس سے کہیں دُور رہتی تھی۔ وعدہ واقرار کے مطابق ایک رات کو ستدن اپنی محبوبہ سے ملنے چلا چنانچہ کہتا ہے:۔

بھنگوں چپتگاں چاشنگاہ ءَ
لاکوٹوں گنگ بیگاہ ءَ
چاڑاں زرتگنت بگواہ ءَ۔
کاٹاروں دو گوشیں زرتگ۔
شیری پنجگوں گنارتگ
شیری پنجگ دپلگھوری
شنگنت پہ مزن ملگھوری۔

یعنی

دوپہر کو میں نے مُٹھیاں بھر بھر کر بھنگ پی
اور شام کو بے دھڑک چڑھا لی۔
جب کیف و سُرور نے مجھے آہستہ اُٹھایا
تب میں نے اپنی دو دھاری کٹار
اپنے شیر کے جیسے پنجے میں بھینچ لی:
میرے شیر کے جیسے پنجے
اور میرا سنبھالا ہوا سڈول جسم
اُس دراز کاکل محبوبہ پر قربان ہوں۔

---

[1] بلوچستان کے قدیم ہندو باشندوں کو تلدار کہا جاتا ہے۔

سدن گنور جب اپنی محبوبہ کے گھر پہنچتا ہے تو وہ سوئی ہوئی ہوتی ہے۔ سدن اُسے جگاتا ہے۔ اس سے قبل ہم کیاسے عدو کو جگانے کا بیان کر چکے ہیں۔ سدن اپنی محبوبہ کو کیسے جگاتا ہے۔ یہ ملاحظہ ہو، کہتا ہے:۔

رفتاں دراہی ء لالیگ ء
لالیگ ء ، لشکر گالیگ ء
وابنت دوست منی لڈو کہین
کُتہ وگڑا تیں بورپ ء
میتاں من گوڑ اہی ایر شتان
پادگوں مار سریں یاد پہکان
ڈانشانیں تبروت گوں رکھتان۔

یعنی
اس وعلی کے ساتھ
اُس شیریں گفتار، محبوبہ کے ساتھ
کئے ہوئے وعدے کے مُطابق
جب میں وہاں پہنچا
تو دیکھا کہ میری شبک خرام محبوبہ
چارپائی پر پڑے ہوئے
ریشمی گدّے پر سوئی ہوئی ہے۔
میں اُس کے پہلو میں
آہستہ سے لیٹ گیا
میں کر پاؤں

اُس کے پاؤں کے مارِ سر کڑوں پر
اور میری شاندار مونچھیں
اُس کی کان کی بالیوں پر چمک گئیں ۔

سدّن کی محبوبہ سٹ پٹا کر اُٹھ بیٹھتی ہے اور گھبراہٹ میں سدّن سے پوچھتی ہے :ـ

چو منے بچک بھنگیگے
بھنگت وارتگ و جنگیگے
تھاموریں شپاں چی لوٹے ؟
تُرس چہ گیہریں ماران نیست
کہ دمب و گروش کمپانت
ہر تگ گوں زمین ءَ سیابنت ۔
مارِت موزگی پادان وارت
زُومبت نقرہ ئیں اُنگشتان
مات و پُتک ءَ ہر جان بے ۔

یعنی :
اے لونڈے ! تم کون ہو ؟
کیا تم نے بھنگ پی ہے کہ یوں بھڑ رہے ہو
آخر ، اِسی اندھیری رات میں کیا چاہتے ہو ؟
کیا تم اُن زہریلے سانپوں سے نہیں ڈرتے

---

۱ ؎ وہ کڑے جن کے دونوں سرے سانپ کے سر کی طرح ہوتے ہیں ۔ اُلا

جو ہمہ رنگ زہرِین سیاہ ہیں

اور جو سر اور گردن یکجا ملائے (رستوں پر) پڑے رہتے ہیں۔

اگر کوئی سانپ

موزوں والے تیرے پاؤں پر کاٹے

یا کوئی بچھو تیری نقرئی اُنگلی پر ڈنگ مارے

تو تیری ماں اور تیری داری بیٹھ کر

تمہارا ماتم کریں گی۔

ستدن گنور کہتا ہے کہ جب میں نے اُسے سمجھا دیا کہ میں کون ہوں اور کیوں آیا ہوں تب وہ سنبھل گئی اور مجھ سے کہنے لگی :ــ

پیش کپ من دمانے کایان

دُرتہ دانگ و میچینان

شاگیں گرانز اگائی دابینان

دوست و دشمنان داب گیجان۔

(یعنی

تم آگے چلو

میں تھوڑی دیر میں آجاؤں گی

پہلے اپنے دُردانہ بیٹے کو دُودھ پلاؤں

اور اُسے شیشم کے پنگوڑے میں سُلا دوں۔

دوست اور دشمن بھی سو جائیں

تب میں آؤں گی

میرا انتظار ضرور کرنا)

سدّن کہتا ہے مجھے خیال آیا کہ شاید وہ مجھ پر بھروسہ نہیں کرتی اور سمجھتی ہے کہ میں انتظار نہیں کر سکوں گا اور وہاں سے بھاگ جاؤں گا۔ تب میں نے اسے جواب دیا :-

قولاں پہ بگھانہ نندت
جتّ و مولدی تچگ ذاتان
نہبتگیں چو منیں ورنایان۔

یعنی؛

اپنا قول پورا کرنے کو
بزدل نہیں بیٹھ سکتے
یا اونٹ چرانے والے ساربانوں
اور کنیزوں کے بیٹے
بھاگ جاتے ہیں؛
نہ کہ، مجھ جیسے نوجوان۔

سدّن کہتا ہے کہ پھر میں وہاں سے پہاڑوں کی طرف چلا اور اپنی محبوبہ کا انتظار کرنے لگا :-

سہ گپتوں بلندیں کوہے
دیگندوں وتی شانگ واتگ
پید اکنت منی ماہیں دوست
کہیت و پدیہ اچاراں انت
شاریں دامن سہ داران انت
سرن ءَ چو کرمچہ پروشان انت۔

یعنی؛

میں ایک اُونچے پہاڑ پر چڑھا

وہاں سے اپنی آنکھوں کی دُور بین سے دیکھا

کہ میری مہوش محبوبہ چلی آ رہی ہے

پیچھے مُڑ مُڑ کر بھی دیکھتی ہے

اور اپنے ریشمی پیراہن کا دامن بھی سنبھالے ہوئے ہے۔

اُس کی کمر سَرو کے نہال کی طرح بل کھاتی ہے۔

آخیر میں سدّن گشو، اپنی محبُوبہ کی تعریف میں کہتا ہے کہ ؎

آشک ءَ داتگنت چم و پونز

سیئُگاں ءَ ہوگیں رفتار

کبک ءَ لُڈّگ و جیڑ ہیں گام

ایشی داتگنت دوستیگ ءَ

کُلّ ءَ شر تریں مور تیگ ءَ۔

یعنی،

ہرنی نے اُسے

اپنی چشم و بینی دی ہے۔

ستی نے اُسے

اپنی رفتار کی رَوانی دی ہے۔

چکور نے اُسے

اپنا خرامِ ناز اور چھوٹے چھوٹے قدم دیئے ہیں۔

یہ سب ادائیں

اُس معطّر گیسوؤں والی کی ہیں۔

جو خیمے میں رہتی ہے

اور جو میری محبوبہ ہے۔

ریحان رند، خانہ بدوشوں اور بادیہ نشینوں کا شاعر ہے۔ وہ عوام کی بالخصوص گلہ بانوں کی بات کرتا ہے۔ اُس کی محبوبہ ایک خانہ بدوش دوشیزہ ہے۔ خانہ بدوشوں کی جو زندگی ہوتی ہے ریحان اُس سے واقف ہے۔ اُس کی زبان اتنی پاک، سلیس اور سادہ ہے کہ بلا مبالغہ دل میں اُتر جاتی ہے۔ ملاحظہ ہو اپنی ایک مشہور اور دل موہ لینے والی نظم میں ریحان کہتا ہے :-

حال منءَ توک ءِ بیگ ءَ ہیتہ

وت منءَ دوستیں مردماں داتہ

چاکر ءَ لڈ ءَ وتی ءَ ہیتہ

بارت منی زنزیر مھریں دوست ءَ

بارتی من کوہ ءَ وکچّاں رولی

کے ترا کوہ و کھنڈگاں پولی!

یعنی

مجھے چاند کی پہلی کو شام کے وقت خبر ملی

بلکہ کچھ دوستوں نے آکر اطلاع دی

کہ چاکر کے دل میں

یہاں سے لدکر جانے کی خواہش پیدا ہوئی ہے۔

وہ میری زنجیری گیسوؤں والی محبوبہ کو

یہاں سے لے جائے گا

پہاڑوں اور سنگلاخوں میں لے جاکر

اُسے خوار کرے گا۔

اے میری محبوبہ !
ان پہاڑوں اور گھاٹیوں میں
پھر کون تم کو تلاش کرتا پھرے گا۔

ریحان کو خیال آتا ہے کہ اُس کی محبوبہ کے پاؤں نازک ہیں سنگلاخوں میں چلنے پھرنے سے دُکھ جائیں گے۔ اُس کے پاؤں میں کم از کم ایک اچھی نرم چپلی ہونی چاہیے۔ یہ خیال ہے وہ گاؤں کے موچی کے پاس جا کر اُس سے کہتا ہے :۔

چاگِرّاں دو چیت ڈِرو ء موچی
چاگراں دوچ ورنرم کمن پیزاں
پادمنی دوست ء نرم و نازرکنت
گوں کہیانی ٹنگاں دور بنت ۔

یعنی

اے گاؤں کے موچی !
تم چپل بیتے ہو ۔
میری محبوبہ کے لئے بھی
ایک چپل سی دو ،
جو اُس کی ایڑیوں کو
زیادہ نرم رکھنا ۔
(کیونکہ) میری محبوبہ کے پاؤں
بہت نرم اور نازک ہیں
اچھلا اچھلا کر چلنے سے
دُکھ جاتے ہیں ۔

اور پھر ریحان دوست کی جدائی کے غم میں کھو جاتا ہے۔ تصور کی نگاہوں میں اپنی محبوبہ کو موڑ ہی کے ساتھ پیدل چلتے دیکھتا ہے۔ اس کی حالت پر ریحان کا دل دکھتا ہے۔ اس لئے کہتا ہے: ؎

من دنی دوست ءَ بہ ذب ءِ سی یان
یکبرے روت و بیر وال کار بیت
ورانچ کنت جنی رسید گیں دستان
گر یہ کنت آسگی کپلیں چمان

یعنی:

میں اپنی محبوبہ کی عزو خصلت کو جانتا ہوں
وہ یہاں سے جائے گی
لیکن ایک بار پھر پلٹ کر ضرور آئے گی
میرے سامنے اپنے مہندی رچے ہاتھ پھیلائے گی
اور اپنی ہرنی جیسی
کاجل آلود آنکھوں سے
آنسو بہائے گی۔

شادین رند ایک بڑا البیلا جوان اور البیلا شاعر گذرا ہے۔ وہ ایک اچھا شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہادر، بیباک اور نڈر نوجوان بھی تھا۔ اُس کی زبان صاف شستہ اور شیریں ہے۔ اپنی بات دوٹوک کہہ دیتا ہے چاہے اس میں اُس کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ شادین نے کئی خوبصورت اور دلپذیر نظمیں کہی ہیں۔ مثال کے طور پر اُس کی ایک نظم سے کچھ حصہ

---

(۱) خانہ بدوشوں کا کاروان - ایضاً

اقتباس پیش کرتے ہیں جس میں اُس نے اپنی محبُوبہ سے ملنے جانے کے واقعہ کو بڑی خوبصورتی اور روانی سے قلمبند کیا ہے ۔ کہتا ہے :ے

پیگیام کُت شہ دُرو شم ءَ
لال ءِ گوں اَلمت وکیں دپ ءَ
شادین ترا شاہ ءِ سرانت
حق و نحق بیا بگہ ءِ ۔

یعنی

اس اچھے خدو خال والی
ھنس مُکھ محبُوبہ نے پیغام بھیجا کہ
شادین ! تُم کو اللہ کی قسم ہے
ضرور ، بالضرور
آج رات میری مُلاقات کو آجانا ۔

شادین پر شاید کسی اور طرف سے کوئی ایسی پابندی تھی کہ وہ علی الاعلان اپنی محبُوبہ سے ملنے اُس کے گھر نہیں جا سکتا تھا اِس لیے کہتا ہے :ے

نیمُون ءِ گورا گُت ین
گوران دگُلی کر گزان ۔
دیا دُنیایاں دیشگان
ہیر مرد و جیڑتیں چیر ڈوے ۔
بچّو ! ہما لوگاں مُرد
آ لوگ شمیراں لدّتہ
یک منزلے دیما شُتہ ۔

مردان تئی سامان گت۔
بھینگ من گلیاں بستگنت
توپ چی من گشّاں نیاشتگنت
مردگوں بروگیں خنجران
پرتئی زباں ء نشتگنت۔

یعنی ؛

میں گورسے نکلا
اور گاؤں کی حسیناؤں کو دیکھنے کے بہانے نکلا۔
آگے جا کر میں نے بہت سے لوگ دیکھے
بُڈھے آدمی اور چھوٹے بچے سب جمع تھے
اُن میں سے ایک نے کہا :
بیٹا ! اُن گھروں کی طرف نہ جانا
وہ گھرانے یہاں سے لدکر
ایک منزل اور آگے گئے ہیں ۔
اور ، اُن لوگوں نے
تیرا انتظام کر دیا ہے
دروازوں پر کُتّے باندھ رکھے ہیں
پہاڑی دروں اور گھاٹیوں میں نشانہ باز بندوقچی بٹھا دیے ہیں
اور باقی تیز خنجر سنبھالے
تم کو نقصان پہنچانے کی تاک میں بیٹھے ہیں ۔
شادین کہتا ہے کہ میں نے اُن لوگوں سے کہا ؛

عقلبت رواتءُ مردُمان
من گرنہ زانتی بیتگان
من ہیّوکی ءَ رفتگان
مرد ! من کلاتاں اَڈ نہ بان
لے تہ بلوچی ڈنگر تنت ۔

یعنی:
اے لوگو !
تمہاری عقل ماری گئی ہے
اُن دِنوں سے
جبکہ میں ایک نادان لڑکا تھا
میں اکیلا ہی پھرتا رہا ہوں
اے لوگو ! اب میں نوجوان ہوں
بڑی بڑی فصیلیں میرا راستہ نہیں روک سکتیں
یہ تو ، بلوچوں ہیں
معمولی رکاوٹیں ہیں ۔

شادین نہیں رُکا اور بالآخر اُس مقام پر پہنچ گیا جہاں پر اُس کی محبوبہ نے اُس سے آ کر ملنے کا وعدہ کیا تھا ۔ کہتا ہے :-

ذرا ہی بوجند ءِ اَنگکان
مرزنگ ءِ واریش ییگان
ذہال جو سر ۔ نہ جیا گمان
بیم وا بنت و دلی ذرانت

گوشانوں کپتنگ رپتڑ گگے
دوست ءِ گمانوں باز گو رَنت
لُشی ءِ نہ گوریتین جیتڑ گگے
دستینگ دُول ءِ چینا گِنت
زر ءِ جُلُماں ہو ہو انت
زر گوان شھما گِنت
مپت گام مِس دیپانی نشتین
ویم بالوانی چُکتین۔

یعنی

وعدے کے مطابق
میں مقررہ مقام پر پہنچا۔
احتیاطاً وہاں سے کچھ پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا
اور پھر ڈھال کو سرہانہ بنا کر لیٹ گیا۔
میری آنکھیں بند تھیں
لیکن دل میرا بیدار تھا
میرے کانوں میں
پائل بجنے کی ایسی آواز آئی
جیسی ساون کی بارشوں کی
تجڑن لگنے سے آتی ہے۔
مجھے اپنی محبوبہ کے آنے کا
زیادہ گمان ہوا۔

Scanned with CamScanner

پھر اُس کی دستی اور چوڑیوں کی
جھنکار ہوئی۔
اور اُس کے طلائی بُندوں کی
تھرتھراہٹ سُنائی دی۔
اور آخر، اُس کا طلائی ٹیکہ
چمکتا ہوا نظر آیا۔
میں اُٹھا
اور سات قدم آگے
اُس کے استقبال کو گیا۔
اور اُس کا دمکتا ہوا چہرہ
چُوم لیا۔

شاعرانہ طریقۂ بیان کے مُطابق اِس کلام کو یہاں ختم ہونا چاہیے تھا، مگر، شادین اپنی بہادری، اپنی محبوبہ کی جرأت اور اُس کے فرضی خاوند کی بزدلی دکھلانے کو مزید کہتا ہے کہ

اَکھ جن ءِ مرد شہ درءَ
لیٹیت من ءُ ل ءِ منجب ءَ
زُرتی ہمبکاں پہ سرءَ
پول کُرتی آتش ماہیں جن ءَ
بُراتش تون، یا آتش من اِں؟
بس اِنت کل ءِ کور میں دل۔
نے آتش تو ... نے آتش من ...
اَتشس تا پی تیج و زرد ل

بوشش زہیری واجہ اں ،

دوشی مقابل بیتگاں ۔

یعنی

جب محبوبہ کا خاوند باہر سے آیا

آکر اُس پیاری کی چارپائی پر لیٹ گیا

تو اسے بڑی مہک آئی ۔

اُس نے اپنی ماہ جبیں بیوی سے پوچھا

یہ خوشبو تم سے آرہی ہے

یا مجھ سے ۔

آفریں ہے اُس مجھول جیسی عورت کے

پتھر جیسے دل کو

کہنے لگی :

یہ خوشبو نہ تم سے آرہی ہے

اور نہ ہم سے

یہ تو کسی اور باپ کے بیٹے کی مہک ہے

اُس سانڈنی کے مالک کی

جس سے رات میں مل کر آئی ہوں ۔

محبوبہ کا خاوند سیخ پا ہو گیا اور تلوار نکال کر اُس سے کہا کہ توبہ کر اور

معافی مانگ ورنہ تیری گردن اُڑا دوں گا ۔ عورت نے جواب دیا ۔ کہ

تو منی دست ءَ نہ بیت

توبہ ءِ وال گشت

ساہ پہ بہاءَ گیْنگَنت ۔

مو کل تئی باگھارَ گُش ،

جن مئی لیتریں شہین گردن ءَ ۔

یعنی :

میں توبہ کروں !

یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا ۔

توبہ تو وہی عورتیں کرتی ہیں

جنہوں نے اپنی زندگیاں خریدی ہوئی ہوتی ہیں

تجھے اجازت ہے ،

اپنی اس سانڈ سے مارنے والی تلوار سے

میری لمبوتری گردن اُڑا دے ۔

غلام محمد بالاچانی مزاری' بلوچی کا ایک مشہور شاعر گذرا ہے جس کی نظمیں سنگین اور عالمانہ رنگ لیے ہوئے ہوتی ہیں ۔ جنگ ، بڑھاپا ، جوانی اور اس قسم کے موضوعات پر اس نے خیال آرائی کی ہے اور بہت دانشمندانہ باتیں کہی ہیں ۔ ایک نظم میں غلام محمد بالاچانی نے اپنی عاشقی کا ایک واقعہ بیان کیا ہے ۔ تفصیلات ضروری نہیں صرف یہ دکھلانا مقصود ہے کہ اس دور کے تمام بلوچی شاعروں نے اسی ایک ہی موضوع کو کہ "محبوبہ نے بلایا اور میں گیا" اپنی جولانی طبع دکھلانے کے لئے پسند کیا ہے اور سامعین بھی اسے شاعرانہ تعلّی سمجھ کر برا نہیں مانتے تھے بلکہ شاعر کے حسن گفتار سے محظوظ ہوتے تھے ۔

غلام محمد بالاچانی کہتا ہے کہ ایک مرتبہ اُسے دوست کا پیغام ملا کہ :۔

روش مں دگرءَ کوندان جنت

کوہانی صرءَ ڈولو بیت

استار من ئُج ءَ سار ابیت،

شنج کن مرکب ءُ تُرندین ءَ

ورگو کپین کُمیت ءِ چکّت ءَ

بیاری دال منی پاکھیر ءَ

بندی دامن ءِ گزّ پیگ ءَ

نندوُ پتّی ہیل ءَ بی ۔

یعنی:

عصر کے وقت،
جب سُورج گھُٹنے ٹیک دے
اور پہاڑوں پر جھُک جائے
ستارے کہیں ظاہر ہوں :
اُس وقت اپنے شوخ گھوڑے پر
اُس کُودنے والی کُمیت کی پچھیری پر
زین ڈال دے۔
اور اُسے میرے خیمے کے قریب لا کر
ایک گز[1] کے نیچے باندھ دے
اور خود ایک طرف بیٹھ کر
میرا انتظار کر۔

جمشید مری نے اگرچہ کلاسیکی شعراء کی پیروی میں نظمیں کہی ہیں لیکن ان

---

[1] ایک جنگلی درخت جسے لئی بھی کہتے ہیں۔

ر، دورِ جدید کے شعراء میں کیا جا سکتا ہے۔ اُس نے مختصر اور کم سے کم ابیات میں وہ بات ی ہے جو بعض دوسرے شعراء ایک طویل نظم میں کہتے رہے ہیں۔ جمشیر مری کی ایک مشہور نظم خط ہو جس میں وہ اپنی محبوبہ کو اپنی محبت کی پائیداری و استواری کا یقین دلاتے ہوئے کہتا ہے۔

کلاں ہمار روشی ترا
کہ استاں قطب ءُ جُند ءَ ریت،
سوہیل بیت اَش قبلوءَ
یا روش شہ آنگو درکپیت۔
میر جاہ کرءِ مارا ہی بُن ءَ
ھدی حدءِ سانی گو ریت
گوگ زانت بیارنت مادنان
بیر ؤ مُسلمانی جبیت،
لیا ہمار روشی سدریت۔

یعنی:

میں، اُس دن
تم سے دستبردار ہو جاؤں گا
جس دن قطب کا ستارہ بھی
گردش کرنے لگ جاتے
اور سُہیل کا ستارہ
مغرب سے طلوع ہو جاتے۔
یا، سُورج
اُس طرف (مغرب) سے نکلے

میرے بالکی ماڑی کے نیچے
صدیاں گزر جائیں۔
جب گائے
گھوڑی کے بچے جنیں
اور دُنیا سے مُسلمانی بالکل مِٹ جائے
تب میری اُمیدیں
تُم سے ٹوٹ جائیں گی۔

جمشیر مری کی شاعری میں دلکشی بھی ہے اور مزاح بھی۔ شُمس[illegible] شراب کا ایک لبریز جام ہے جس کے ہر گھونٹ میں تلخی بھی ہے اور نشہ بھی۔ جمشیر ایک[illegible] حسینہ کو دیکھ کر کہتا ہے:۔

دانی گسان وکسترنت
نوکی ء بلیت تیلاں چڑھیت۔
مُرگھاں مں بال ء واپ بارت
کھندوک ء ورنائی وہی۔
گوانتے رکشتی ڈکن ء
چنڈ یتگنت درشگ ء ٹھلی
من دی مُدائی توکل ء
پر یتگاں لُپشتی دتی
کے زانت بچے ورنشک ء برے
مٹے پلو ء چکّ ء کپی۔
یعنی:

اب تک تو وہ
چھوٹی سی اور کم سن ہے
جب وہ نئی نئی جوانی کو پہنچے گی
تو اس تنہیں سکھ کی نوجوانی
پرندوں کو پرواز کے دوران سُلا دیگی ۔
جنوب سے جو تُند ہوا چلتی ہے
وہ درختوں کو ہلا ہلا کر
اُن کے پھل گرا دیتی ہے
میں نے بھی
خُدا پہ توکّل کر کے
اپنی چادر بچھا دی ہے ۔
کون جانے
شاید اِس درخت کا کوئی پھل
میرے دامن میں بھی گرے ۔

جمشیر مری، شاعری میں بیباک بھی ہے اور راست گو بھی۔ ایک حسینہ پر اُس کا دل آجاتا ہے تو اُس سے مخاطب ہو کر ایک عجیب انداز سے کہتا ہے :ے

نتے ماہ گوں اِستالاں ترّ ذی
نتے روچ گوں تی ذاتے !
عاشق مناں معشوق تو ئے
دلستءَ من ءَ دے ئی پری
ہر دو مئے سکہ تو یار ئے سکہ

Scanned with CamScanner

من آشکگاں ، ٹکلاں سری۔

(یعنی)

نہ مجھے چاند اور ستاروں کی

چمک دمک اچھی لگتی ہے

اور نہ ہی میری روح

کسی اور عورت کی طرف مائل ہوتی ہے

میں صرف تیرا عاشق ہوں

اور تو صرف میری معشوق ہے۔

اے گل پری ، آؤ

اور مجھ سے ہاتھ ملا کر وعدہ کرو

کہ، جب کبھی تم کوئی یار کرو گی

(تو ، پہلا حق میرا ہے)

کہ میں سب سے پہلے آیا ہوں۔

بجار مری خود بھی ایک اچھا شاعر تھا لیکن اس کے بیٹے رحم علی نے شاعری میں وہ نام پیدا کیا جو رہتی دنیا تک بلوچستان میں یاد رہے گا۔ کہتے ہیں ایک دفعہ بجار مری کہیں جا رہا تھا، ایک خوبصورت عورت سے اُس کی ملاقات ہوئی جو بڑی حسین، چنچل اور بیباک تھی۔ اُس کے اور بجار کے درمیان کچھ باتیں ہوئیں، کچھ وعدے وعید اور راز و نیاز ہوئے اور دوبارہ ملنے کا وعدہ بھی طے ہوا لیکن بعد میں اس عورت نے بیوفائی کی اور مقررہ مقام پر بجار سے ملنے کو نہیں آئی۔ بجار نے جل بھن کر ایک انتہائی نظم کہی اور اُس میں اُس عورت کو ایسی بد دعائیں دیں کہ سن کر دل دہل جائے۔ کہتے ہیں کہ بجار کی بد دعائیں اُس عورت کو لگیں اور وہ اندھی ہو گئی۔ بہر حال غرض بجار کی شاعری سے ہے اُس کی زندگی سے نہیں۔ ویسے بھی بلوچ عموماً شاعروں کو

سیاہ[1] زبان سمجھتے ہیں اور اُن کی بددُعاؤں سے ڈرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو بجارمری اسی واقعہ
سے متعلق کہتا ہے کہ :-

من دی پہ پیر و مُرشد ءِ دُعاءَ
کہنگوں، درکپتوں پہ ہماراہ ءَ
ناگماں بیتوں گوں مردُمے گالی
کمندگے جنت و کنتنوں دُراہی
دراج گتہ راستیں دستی گوں بانہی :
اُش ترو دیا تیمُریں کوہے
پاچنی گٹ و سو گہیں رودے
من ہما گٹ ءِ چکڑ ءَ کپتے
آپے، چونکا بیں کلامان اِنت
تیزرنت چو نوک سماں ہو کیسان
کپینت چو بھنگاں واب برو کینان
سارتنت چو کہن آپاں ٹہتیلیگا
وُش اِنت چو تحی پکلیں و نگان۔
گندی سو ہوبی، سو ہوری جوان اِنت
پہ شکارانی چرگ ءِ کایے
گند! نوادر کاربی، ترادیچے۔
یعنی ۱

---

۱ وہ شخص جس کی بددعائیں اثر کریں۔ الخ

پیر و مُرشد کی دُعا سے
میں بھی آ کر اُسی راستے پر چل پڑا
اچانک ایک عورت میرے سامنے آ گئی
اور ہنس ہنس کر مجھ سے باتیں کرنے لگی
اور پھر اپنا دایاں ہاتھ بڑھا کر اشارہ کیا
اور کہا کہ
تمہارے سامنے وہ جو اُونچا پہاڑ ہے
وہ بہت ہی دشوار گذار ہے۔

اُس پر سے
صرف پہاڑی بکروں کے چلنے کی
ایک پگ ڈنڈی جاتی ہے۔
اس گھاٹی کے قریب
پانی کا ایک چشمہ ہے
جس کا پانی
بارش کے پانی کی طرح مقطّر
نئی سان چڑھائی ہوئی تلوار کی طرح
سبز و آبدار ہے۔
بھنگ جیسا پُرکیف اور خواب آور
سُہیل کے موسم کے کنوئیں کے پانی کی طرح ٹھنڈا
اور دُنبے کی
بلیچہ نی پکائی ہوئی میٹھی کی طرح لذیذ ہے۔

عہ بلوچی کباب

تم اُسے جا کر دیکھ لو
اُس کے محل وقوع سے واقف ہو جاؤ
کہ واقف ہونا، اچھا ہوتا ہے۔
تم شکار کے لئے
ہر وقت گھومتے پھرتے اس طرف آتے ہو
ممکن ہے کبھی تم کو
اُس کی ضرورت پڑ جائے۔

عورت نے درصل کنایتہً ساری بات کہدی۔ بجار بھی سمجھ گیا کہ اُس کا مقصد کیا ہے۔ بات اُس نے گرہ میں باندھ لی اور وقت مقررہ کو اُسی طرف چل پڑا لیکن کہتا ہے:۔

پہ گوراں شوں داتے ءِ الّتیک ءَ
کہ رات ءِ نہلنچ کہ مارا پہ اُمتی
منڈ یا، رستاں پہ پھنچی بو رستی
گردن ءِ مہلنچ ءِ مُرپہ سنداتے
پھلّی مں ہر دو دیدگاں نندات
مے دل ءِ ٹک دات اَچ وتی جند ءَ
چو کتور زین گہنیاں دو نگینان
گمر ءِ وتی لتیبیں اُدو رنگان
چھتّی پہ پیروزی۔ گہیں تگان
باز نی پہ پیشانی مُرو ڈاتاں
چنگلاں شنگرینان اُدو جان ءَ

Scanned with CamScanner

یعنی

میں اُس اُمل کی بتلاتی ہوئی نشانیوں پر
چل کر وہاں پہنچا
مگر ہائے! اُس مہلنج نے
خدا کرے کہ وہ اندھی ہو جائے
مجھے دھوکہ دیا۔
اُس کے دونوں ہاتھ ٹوٹ جائیں
کہ اُس نے وعدہ خلافی کی۔
شئے مُرپیا اُس کی گردن توڑ دے۔
اُس کی دونوں آنکھوں میں
پھولا بیٹھ جائے۔
کہ اُس نے میرے دِل پر داغ دیئے ہیں
جس طرح کنروں کے اُن دورنگی کبوتروں کو
جو خوشی سے غٹرغوں کرتے
اور طرح طرح کی ادائیں دکھلاتے ہیں
اور جن کی آنکھیں
فیروزے کے نگینوں کی طرح چمکتی ہیں
اور جن کو جھپکے سے باز اُچک کر
اُن کی گردن مروڑ کر
اپنے تیز چنگل اُن کے جسموں میں
پیوست کر دیتے ہیں

Scanned with CamScanner

خدا کرے کہ اسی طرح

شاہینِ قضا اُسے بھی دبوچ لے۔

بلوچی شاعری میں سوال و جواب یا مکالمے کی صورت میں کئی اچھی نظمیں کہی گئی ہیں۔ بڑھاپا اور جوانی۔ جھوٹ اور سچ۔ غیرت اور بے غیرتی۔ آگ اور پانی۔ بیل اور گھوڑا، وغیرہ، مکالموں کی صورت میں موثر انداز بیان میں ہیں مگر۔ ذیل میں جس نظم سے ہم اقتباس پیش کر رہے ہیں وہ ایک لڑکی اور لڑکے کے درمیان جوابی مکالمہ ہے۔ آپ اُسے ایک ایسا دوگانا کہہ سکتے ہیں جسے لڑکے اور لڑکیاں مل کر گاتی ہیں۔

نظم کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ ایک لڑکی پہاڑ پر چڑھتی ہے اور وہاں پھنس جاتی ہے نیچے نہیں اُتر سکتی۔ اتفاقاً ایک نوجوان سفید چادر اوڑھے پاس سے گزر رہا ہوتا ہے۔ لڑکی اُسے آواز دے کر بلاتی ہے اور کہتی ہے کہ اُسے چٹان سے نیچے اُتار دے۔ لڑکا شرارت پر اُتر آتا ہے۔ لڑکی سے پوچھتا ہے کہ اگر میں تم کو چٹان سے نیچے اُتار دوں تو تم مجھے انعام میں کیا دو گی۔ لڑکی کہتی ہے کہ اپنے کانوں کے بُندے اور ہاتھوں کی چوڑیاں تم کو انعام میں دوں گی۔ لڑکا کہتا ہے نہیں میں خود تم کو انعام میں لے جاؤں گا۔ لڑکی کہتی ہے۔ بالکل نہیں میں کبھی تمہارے ہاتھ نہیں آؤں گی۔ اس طرح مکالمہ شروع ہوتا ہے! ہو بذا ہے

من زامرے تعبیں بین ، بماگٹ ءُ چورڈ جنین

من کوہی مُنگلے بین ، تئی چوڑان ءُ وَرین

من ٹیلیں آنکے بین ، بماگتان درچ بین

من کرتلیں تازی ءِ بین ، بمارندا ئت گرین

من تئی مُمرگ شکے بین ، بمابوجان چیر بین

من شپانک مردے بین ، ترا دسلتوں جنین

من گَڑی گوگُزتے بین ، ہمار یکان بُنز ہیم
من لیٹر دے چترین بین ، تتی مسر بوُراں دَیر بین

من اُرُتی ڈے پُھتلیں بین ، ہما بگت ءِ گوں کیبین
من کابُلی ترُکے بین ، نزا پہ زرّءِ گِرین
من گھلنگ ءِ دھانے بین ، ہماز اگھاں اِیر کپین
من سیٹھیں بُقالے بین ، ترا پہ کبُیل ءِ بُرین

من اَرزن ءِ دھانے بین ، ہماز یکاں بُڈ دَیر بین
من بانگوئیں مُرغے بین ، ترا پہ سنت چنین
من جمبر ءِ شنکے بین ، ہما آسمان ءِ گرند کنین
من مبیش ءِ تُرلاے بین ، تتی نزکا آپانی دَیر بین

من مُلمُلیں پاگے بین ، تنک گوا ہرام ءِ سرءَ
من چنگ جنیں ڈومبے بین ، ترا پہ داد ءِ بُرین
من گوانزگی ملفلے بین ، برا آجُلوُنٹ ءِ ماب کنین
من ملکموُت نِرتے بین ، ترا پہ مرگ ءِ بُرین۔

یعنی
میں تمہاری کی گھنی بیل بن کر
گھاٹی میں پھیل جاؤں گی۔

ع١ چٹانوں پر اُگنے والی ایک سدابہار بیل۔ آخ

Scanned with CamScanner

میں ایک پہاڑی بکرا بن کر
تیری ٹہنیاں چر لوں گا۔

میں ایک ہرنی بن کر
میدان میں نکل جاؤں گی
میں ایک شکاری تاڑی بن کر
تیرے پیچھے پڑ جاؤں گا۔

میں پہاڑ کے دامن میں خرگوش بنکر
جھاڑیوں میں چھپ جاؤں گی۔
میں ایک چرواہا بن کر
تم کو اپنے ہاتھ کی لاٹھی سے مار گراؤں گا۔

میں ریت کے ٹیلے پر
گز بٹے کا ایک اونچا درخت بن جاؤں گی
میں ایک نوجوان اونٹ بن کر
تیری پتیاں کھا جاؤں گا۔

میں ایک خوبصورت اونٹنی بن کر
اونٹوں کے گلے میں مل جاؤں گی
میں کابل کا ایک ترک (سوداگر) بن کر
تم کو خرید لے جاؤں گا۔

[illegible]

میں گندم کا غلہ بن کر
غلوں کے ڈھیر میں چھپ جاؤں گی
میں ایک ہندو دکاندار بن کر
تم کو تول کر لے جاؤں گا۔

میں باجرے کا دانہ بن کر
ریت میں دھنس جاؤں گی
میں اذان دینے والا مرغا بن کر
تم کو اپنی منقار سے چن لوں گا۔

میں آسمان پر بادل بن جاؤں گی
اور مینہ بن کر زمین پر برسوں گی
میں بھیڑوں کے ریوڑ میں ایک بھیڑ بن کر آؤں گا
اور تازہ برسے پانی کے ساتھ تم کو پی جاؤں گا۔

میں ملک گوہرام کے سر پہ
ململ کی پگڑی بن جاؤں گی
میں چنگ بجانیوالا ڈوم گویا بن کر
تم کو بخشش میں لے جاؤں گا۔

میں شیر خوار طفل بن کر
پنگھوڑے میں سو جاؤں گی
میں موت کا ظالم فرشتہ بن جاؤں گا

Scanned with CamScanner

اور تم کو جان سے مار کرلے جاؤں گا۔

بلوچی کے شاعروں نے جو مکالماتی نظمیں کہی ہیں وہ ہر لحاظ سے بھرپور اور نصیحت آمیز ہیں۔ ایسی بعض نظموں میں اگرچہ عاشقانہ بانکپن بھی ملتا ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اُن میں بھی نصیحت و عبرت کا پہلو نکلتا ہے۔ میر عبدالکریم ساجدی کی مکالماتی نظم "عقل اور عشق" اِس قسم کی نظموں کی ایک اچھی مثال ہے۔ اس سے مجموعی طور پر جو تاثر پیدا ہوتا ہے وہ سبق آموز ہے۔ میر عبدالکریم ساجدی کہتا ہے :-

مہلقا، زیبائیں ڈُر دپ ءِ، درد ان
من شپے کشتہت آہ و آہسر دان
عشق منی ہچو رہزن تت مردان!
عقل سرءَ، ہسل چوکی ءَ گردان۔

یعنی

میں ایک رات کو
اُس مہلقا اور دُرِّ دہن حسینہ کے فراق میں
سرد آہیں بھر رہا تھا
اور اے جوان مردو!
عشق ایک رہزن کی طرح میری تاک میں
اور عقل چوکیدار کی طرح میری حفاظت کے لئے
میرے ارد گرد گھوم رہے تھے۔

اِن ابتدائیہ ابیات کے بعد عشق اور عقل میں جد وجہد اور کشمکش کی ابتدا ہوتی ہے۔ شاعر کو عشق ورغلا کرلے جاتا ہے اور عقل اُس کا راستہ روک لیتی ہے اور سمجھا بجھا کر اُسے واپس لے آتی ہے اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے تا آنکہ عقل، عشق پر حاوی

کامیابی حاصل کر لیتی ہے مگر، شاعر کو اطمینانِ قلب حاصل نہیں ہوتا۔ ملاحظہ ہو، میر عبدالکریم کہتا ہے :-

عشقءَ منءَ یکدم پاد کنت گلءَ ،
گُرں گماں آ گشتہ مبو ملّا
بیا، پما زور و توکل اللہءَ
سوار بیو تیز و دش رَوین ملّءَ ۔
من پما الحکم و گُرتشینءَ آنی
من گوزرءَ گُرتوں اطلس و شاہی
گُرں وتی عشقءَ رستوں ہمراہی ۔

یعنی :
عشق نے اچانک آ کر
مجھے خیمے سے باہر نکالا
اور کہا :
اے ملّا !
اس طرح غموں میں اپنے کو مبتلا نہ رکھ
اُٹھ، اللہ پر بھروسہ کر اور حوصلہ سے کام لے
آ، اور اپنے تیز رو گھوڑے پر سوار ہو جا۔
مَیں نے اُس کی بات
حکم سمجھ کر مان لی۔
اپنا اطلس و ریشم کا لباس پہنا
اور عشق کے ساتھ چل پڑا۔

Scanned with CamScanner

جب عقل کو معلوم ہُوا تو عبدالکریم کہتا ہے کہ اُس نے میرا راستہ روک لیا، وہ بہت سہما ہُوا تھا کہنے لگا: ؎

گوں نہوں من، تو رفتگے سارءِ
تو وت ءِ عشق ءِ داتہ ماہارءِ
بازیت تر آ آ، مں جُھلیں گدھارءِ
بیا پدا پِر تو وتی پادءِ
بُرشتوں من پہ درد و خواریءِ
آ کُھر ءِ لستوں بوربزاریءِ۔

یعنی:

مَیں تمہارے ساتھ نہیں ہُوں
تُم اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے ہو۔
تُم نے اپنی تکیل عشق کے ہاتھ میں دی ہے
وہ تمہیں کسی گہری کھائی میں لے جا کر
ضرور گرا دے گا۔
اگر میری بات مانتے ہو
تو آؤ، واپس اپنے گھر چلو۔
مَیں مجبُور ہُوا
اور بہت ہی ملُول اور رنجیدہ
اُس کے ساتھ واپس آیا
اور اپنے بزاری گھوڑے کو
تھان پر باندھ دیا

اِتنے میں عشق ، جو چور اور جاسوس کی طرح پیچھے لگا ہُوا تھا پھر آ پہنچا اور کہنے لگا : ؎

مہلیغ گوں دکانیں گرزنشتہ
آ ، دُن و عطر و عنبراں مُشتہ
عقل بجھائے کہ چوش ترا گوشتہ
گور مبو مہلیغ ءِ عجن پشت ءَ ۔
بادشاہ ءِ من رنگوں اُود ءَ
یاخُدا ! سارٹی ترّ کمن جود ءَ
لسب کنین من گوں مبیوین لود ءَ
پہ وتی تنگیں دل ءِ بود ءَ ۔

یعنی

چور اور جاسوس کی طرح
عشق پھر آ پہنچا
اور کہنے لگا : اے نادان !
وہ خوبصورت چھاتیوں والی مہوش
تیرے انتظار میں بیٹھی ہے ۔
اُس نے اپنے بدن پر
دُن[1] ، عطر اور عنبر مَلا ہے ۔
عقل تو بزدل ہے
اُس نے تم کو غلط مشورہ دیا ہے

---

[1] ایک بلوچی خوشبودار لوبان ۔

اندھے مت بنو

اُس بھلنچ سے مُنہ مت موڑو۔"

اس دفعہ میں ننگے پیر روانہ ہُوا

اور دل ہی دل میں دعائیں مانگتا رہا کہ

یا خُدایا! اُس حسینہ کا خاوند

گھر پہ نہ ہو۔

تا کہ مجھے اُس گھٹا گیسوؤں والی کے ساتھ

کُھل کھیلنے کا موقع ملے

اور میں اپنے دل کی پیاس بُجھا سکوں۔

شاعر کہتا ہے کہ میں اب تک وہاں نہیں پہنچا تھا کہ عقل سنسناتی ہوئی گولی کی طرح آ پہنچی اور غصّے سے ساون کے بادلوں کی طرح گرجتے ہوئے بولی:-

زہے کنی شاباشے گُفتہ چندا

بے ہیال پُوتنے اشس منی پندءَ

تو گونما ہلنچیں شکر کھندءَ

وَتی کہ بُٹاکورے بیت زندءَ!

پرمن ءَ گردینتہ ہُنر بازءَ

آرتہ تا زیکی مزار گرازءَ

آسکلو بند و کت ہماسازءَ۔

یعنی!

شاباش ہے تم کو

اتنی جلدی میری نصیحت بھول گئے

کیا تمہیں اس سے خوشی ہوگی
کہ کل تم پر اور تمہاری ہنس مکھ محبوبہ پر
لوگ آوازے کسیں اور طنز کریں۔

بالآخر، ہنر بلند عقل
مجھے وہاں سے اپنے ساتھ واپس لے آئی
اور ہیبت شیر جیسی چھلانگیں مارنے والے
گھوڑے کے پاس چھوڑ دیا
وہ ہرن نُما گھوڑا
اپنے تھان پر اُسی طرح بندھا ہوا تھا۔
گھر پہنچتے ہی عشق نے پھر عاشق کو آدبوچا اور اُسے معشوق کی یاد دلاتے
ہوئے کہا:—

بیگھاں کہ گیدکُنتلاں رندیت
پہ کہیب آسکی گردن ءِ ورتنجبیت
شیشم ءِ کُٹ و بکھلاں بندیت
پوشیت کیما و اُدُساں چندیت
پرتو وبور ءِ مازگاں بندیت ۔
رنتگوں من پہ مٹگھ وشان ءِ
پہ قصر مادا ءِ دُرّ مرجان ءُ ۔

یعنی
کہنے لگا:
شام کے وقت جب وہ حسینہ

اپنی زلفوں کو شانہ کرتی ہے

اور پھر ایک دلبرانہ انداز سے

اُنہیں، اپنی ہرنی جیسی گردن پر لٹکاتی ہے۔

شیشم کے پلنگ پر

پڑے ہُوئے مخملین گدّوں پر بیٹھتی ہے۔

اطلس و کمخواب کا لباس پہنتی ہے

تب تُم کو یاد کر کر کے

فال پر فال نکالتی رہتی ہے۔

عاشق پھر عشق کے ہاتھوں دھوکا کھا جاتا ہے لیکن عقل جو تاک میں رہتی ہے جھٹ اُسے پکڑ لیتی ہے۔ عاشق کہتا ہے:

رپتگوں من چو ستریں مست ءَ

ناگہاں عقل ءَ گپت منی دست ءَ

پہ گھز بناگی کیسنہ و گشت ءَ

اَچ درءَ نہلنج ءَ گُتہ گُستا

چار کلاک - انگیں شپ ءِ گوستہ

روشنیں روچ ءَ جلوہ پیوستہ

سگ چما بازیں گیگاں گُستہ

تو کجا ءِ بے سارءِ کمر بستہ؟

پہ من ءَ ترینتہ چپو دالی

داب منی دیدوکاں نہ انت جالی

عشق پد اُستیت گوں کمر و ہ دبالی

بلے، من کنین ہر چی نوں عقل پر مائیَ

عشق من ءُ بُر تت دیمپہ رُسوائیَ

عقل مبوّ تین، من گار اتوں جائی۔

یعنی

اَب کے میں ایک بہادرانہ شان سے

اُس سُفید خیمے میں رہنے والی

دُرّ دمرجان کی طرف چلا

مَیں ایک قوی ہیکل مست سانڈ کی طرح

جا رہا تھا کہ

اَچانک عقل نے مجھے ہاتھ سے پکڑ لیا۔

غصّے سے مجھے کھینچ کر

مہلنج کے خیمے کے دروازے سے ایک طرف کو

علیٰحدہ لے گئی اور کہنے لگی

کیا تم نہیں دیکھتے کہ

تاریک رات کے چار پہر گذرنے والے ہیں

اسپیدۂ سحر جلوہ افروز ہونے کو ہے۔

گاؤں کے کُتّے

جو رات بھر بھونکتے رہے

اب خاموش ہو چکے ہیں۔

اِس وقت، تم کہاں کمر باندھ کر

دیوانوں کی طرح جا رہے ہو۔

Scanned with CamScanner

بالآخر، عقل نے مجھے وہاں سے واپس بھیج دیا

لیکن، نیند اب بھی میری آنکھوں میں نہیں آ رہی تھی

عشق، اپنے مکر و فریب کے ساتھ پھر آئے گا

لیکن، اب میں وہی کروں گا جو عقل کہے گی۔

عشق مجھے رُسوائی کی طرف لے جا رہا تھا

اگر عقل نہ ہوتی

تو مَیں واقعی برباد ہو جاتا۔

Scanned with CamScanner

۹

داستان یا داستانگ کے بیان میں

بلوچی کی عشقیہ شاعری کی تین صورتیں اور ہیں جو عوام الناس میں زیادہ ہر دلعزیز اور علم میں یہ ہیں زہیرک، داستانگ اور ڈیہی۔ ان کے علاوہ ایک چوتھی صورت "لیکو" کی ہے لیکن "لیکو" چونکہ صرف ساربانوں کا گیت ہوتا ہے اس میں عشقیہ مضامین کی بجائے، سفر و حضر، سانڈنیوں، گگوں اور موسم وغیرہ کے مضامین زیادہ باندھے جاتے ہیں اس لئے اس مقالہ میں ہم اس کا ذکر نہیں کریں گے۔ جہاں تک زہیروک کا تعلق ہے اس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ اب صرف داستانگ اور ڈیہی سے متعلق کچھ کہنا باقی ہے۔

فارسی اور اُردو میں داستان ایک ایسے طویل افسانہ یا کہانی کو کہتے ہیں جس کے کردار فرضی ہوں لیکن، بلوچی میں داستان یا داستانگ کے معنی کچھ اور ہوتے ہیں۔ بلوچی میں داستانگ ایک غزل یا مختصر نظم ہوتی ہے، جس کا ہر شعر دوسرے سے پیوستہ نہیں ہوتا اور نہ ہی ردیف او قافیہ کا پابند ہوتا ہے۔ اسے عموماً نڑ، گرونڈ[1] یا سرود کے ساتھ ایک سانس میں گایا جاتا ہے اس ایک سانس میں گانے کے عمل کو سُر اور گانے والے کو سُری کہتے ہیں۔ بعض علاقوں میں سُر کو گٹ بھی کہتے ہیں۔ نظم یا غزل کے بحور کے مطابق داستانوں کے سُر بھی مختلف ہوتے ہیں۔ سُر لعزیز اور مقبول عام سُروں کے نام رکھے جاتے ہیں جو اس محبوب، محبوبہ یا واقعہ سے منسوب ہوتے ہیں

1۔ بانسری کی ایک قسم

جس کے لئے یہ داستان کہی گئی ہے۔

داستان بیشتر عشقیہ ہوتی ہیں لیکن بسا اوقات اِن میں رزمیہ، نعتیہ اور مزاحیہ مضامین بھی باندھتے ہیں۔ بلوچی کی عوامی شاعری کی طرح داستان میں بھی ردیف و قافیہ کی پابندی نہیں کی جاتی البتہ بحر اور سُر کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔

داستانگ عموماً کسی ایک شاعر کی گفتار نہیں ہوتیں۔ مختلف گویّے وقتاً فوقتاً اس میں ابیات بڑھاتے رہتے ہیں پہلے کے بعض بیت متروک ہو کر فراموش ہو جاتے ہیں اور نئے ابیات اُن کی جگہ لیتے رہتے ہیں اور اس طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ہے البتہ شعراء کے کلام کو بھی داستانگ کے سُروں میں گایا جاتا ہے لیکن وہ داستانگ میں شمار نہیں کئے جاتے۔

داستانگ چونکہ براہِ راست عوام کی تخلیق ہوتی ہے اس لئے اس کی زبان سلیس، سادہ اور روزمرہ کے مطابق ہوتی ہے۔ ذیل کی داستانگ ملاحظہ ہو جس میں عاشق اپنے معشوقہ کی تعریف میں کہتا ہے:

کایاں دِرِ پاندیں دِیرو ءِ گنگاپاں گراں
لوگ ءِ یک گنڈ ءِ ٹیک کنت نندیت ماہکان
دوست منی پڑ اے جُڑی ٹکیت نیم شپان
درِ بہین بیت جکّیت چو کہ پیرانی قبوان
لوڈ و جنٹز ساراں، راہی دگانی سُہتگنت
صُورت ءِ ٹوکی ہیتبرتہ چار گنڈیں جہان
گُل سوادی تنت، بالتہ دُھوتوں ہشتگنت۔
گراں گُلی درکپتیت، آش وتی لوگ ءِ ماہکان
آہستگ ءِ جُڑیت چو کمبرِ مارا لوڈ کنت
جُزگ ءِ در ہنزیت ڈوبرءِ تھتاپیں گوتران
جان گوں ذاتاں، پادی گوں مُلتانی جتوان

ڈورہءَ دوستءِ، جمبوئیں وشّیں بوزرت
میدسرءِ پشیشانی گوں کھتوری عطرءَ تنت
پنتّڑ و لڑونت کو بگاں جرمسا گنت
ماہیں دیمانی چو تنگویں شہرانءَ گنت۔

یعنی:

بہت دُور کی منزل طے کرکے مَیں گیا
گاؤں کے قریب ایک ایسی جگہ (چُھپ کر) بیٹھ گیا
جہاں آواز پہنچ سکتی ہو۔
(اور مَیں نے خیال کیا کہ) میری چاند جیسی محبوبہ اِس وقت
اپنے گھر کے ایک کونے میں بیٹھی ہوئی ہوگی۔
میری محبوبہ، اُس لکۂ اَبر کی مانند ہے
جو چمکتی ہوئی بجلیوں سے
آدھی راتوں کو روشن رہتا ہے
اور دھنک کی صُورت اختیار کرکے
پیروں کے مقبروں کے گنبدوں جیسا نظر آتا ہے۔
میری محبوبہ کے خرامِ ناز سے
اُس کے زیور اِس طرح بجتے ہیں
کہ اُن کی آواز
راہ چلتے (مُسافر) کا دِل جلا دیتی ہے۔
اُس کے حُسن کی تعریف
چار دانگِ عالم میں پھیل چکی ہے۔

اُس کے جمال کو دیکھنے کے خواہشمند
(اُس کے گھر کے سامنے) دھونی رمائے
بیٹھے رہتے ہیں۔
جب وہ گراں قیمت محبوبہ
چاند کی طرح اپنے خیمے سے طلوع ہوتی ہے
تو، دھاریدار سانپ کی طرح
آہستہ آہستہ، جھومتی جھامتی
خراماں، خراماں چلتی ہے۔
اور چلتے وقت
اپنے بوجھل پستانوں کو ہلاتی رہتی ہے۔
اُس کے جسم پر ریشم کا رنگین لباس
اور پاؤں میں لٹکتی جھوتیاں، خُوب سجتی ہیں
اُس گلرنگ کی چھاتی سے
خوشبوؤں کی مہک پھوٹتی ہے۔
اُس کے گیسو،
ہمیشہ کستوری اور عطریات سے معطر رہتے ہیں
اُس کے کانوں کے بُندے،
لرزتے، کانپتے
اُس کے شانوں کو چُومتے
اور اُس کے چاند جیسے چہرے کو
سُنہری جِلا دیتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

داستان میں تشبیہ و استعارے عام فہم ہوتے ہیں جو اُسے عوام الناس میں ہر دلعزیز بناتے ہیں۔ مثال کے طور پہ ایک عاشق اپنی معشوقہ کی تعریف میں کہتا ہے :۔

دوستِ مےَ شربتی وَلِّی ئے
تُنّی باں ، وَرت تُرنگانی ۔
من شاں عطری شِیشانئے
پُدوءَ کناں زیرانی ۔

یعنی؛

میری محبوبہ شربت کی ایک پیالی ہے
جب مجھے پیاس لگتی ہے اُسے پی لیتا ہوں
بلکہ، میں کہتا ہوں کہ
وہ عطر کی ایک شیشی ہے
(جب جی چاہے) اُسے اُٹھا کر
جیب میں ڈال دیتا ہوں ۔

ایک اور عاشق اپنی معشوقہ کے خدوخال کو عید کے چاند سے تشبیہ دیکر کہتا ہے :۔

چلّوے زردیں ، ذال ءِ دستانی
دُوربۂ دَعمکا اِنت زبادانی
جھگّڑیں دنتاں ترنت سوادانی
شِیگِلیں پونزے ، چُمّنت سردانی
بیگنت ژنگا گھوگھڑوانی
بے جرّڈیں پرائی گُروکانی

درو شمۂ و نتن ، عیدۂ نوکانی
من دی پہ دیدارۂ ذرّ گانی
گاڑ من عَ پندِ اکشت گنوکانی۔

یعنی

وہ عورت جو میری محبوبہ ہے
اُس کی اُنگلیوں میں سونے کی انگوٹھیاں ہیں۔
اُس کی چھاتی سے زباد کی مہک اُٹھتی ہے،
اُس کے سفید دانت ، قابلِ دید ہیں
اُس کی ناک (سُرمہ لگانے کی) سلائی جیسی
اور اُس کی آنکھیں غزال جیسی ہیں۔
جب وہ چلتی ہے
تو اُس کے زیور گھنگروؤں کی طرح بجتے ہیں
وہ ایسی بجلی ہے
جو بادلوں کے بغیر چمکتی ہے
اُس کا مکھڑا عید کے چاند کی طرح ہے
میں اُس کے دیدار کے لئے تڑپتا ہُوں
(اِس لئے تو) مجھ میں
پاگل پن کے آثار نظر آتے ہیں۔

داستان گو، بڑے بانکے رسیلے نوجوان ہوتے ہیں۔ یہ فن بھی نوجوانوں کا ہے جو بسا اوقات فی البدیہہ بیت پہ بیت بڑھاتے چلے جاتے ہیں یا یُوں کہو کہ موتی کی لڑی میں موتی پہ موتی پروتے رہتے ہیں اِس لئے اُن کی جولانیِ فکر کے لئے میدان بہت

وسیع ہوتا ہے۔ محبوبہ سے متعلق ہر اُس چیز کا ذکر کرتے ہیں جس سے محبوبہ کی تعریف کا پہلو نکلتا ہو۔ ایک عاشق اپنی محبوبہ کو خوش کرنے کے لیئے اُس کی ماں پر خدا کی رحمتیں نچھاور کرتے ہوئے کہتا ہے :

نُگوءِ خُدا بہشت ءُ بارت
لتیانی پھلڑی رود ینتی
چُلیں گوازگ ءِ جھوٹینتی
بچی اُنگلاں لوڈینتی
تاں رنگ جمڑتی اِے سادار
تاں رنگ رُستہ اِے سوتڑا سار۔

یعنی

اُس عورت کو خدا جنت نصیب کرے
جس نے
اِس کھلنڈری گل رُو کو پال کر بڑا کیا
پھولوں کے جھولے میں اُسے جُھلایا
اور بیٹے جیسے اُس کے ناز اُٹھائے
اب دیکھو تو
اِس جاندار نے کیا رنگ جمایا ہے
اور کیسی صُورت
اور کیا حُسن پایا ہے

ایک عاشق وارفتگی کے عالم میں کہتا ہے : ۔

اگر سید رسردارے من گُملا بتی

اَگ بادشاہے تہ من نوکر بانی
تولنت کہ تنخواہ ءَ نہ گرانی
لوگ ءَ نندان چرٹو پہ چمّان گندانی
من چرٹو تو کان گوشہ ارانی۔

یعنی

اگر میری محبوبہ
کوئی سیدانی یا سردار زادی ہے
تو میں اُس کا غلام ہوں۔
اور اگر کوئی شہزادی ہے
تو میں اُس کا نوکر بن جاؤں گا
وعدہ ہے کہ
اُس سے کوئی تنخواہ نہیں لوں گا۔
بس گھر میں بیٹھ کر
اُس کی صورت دیکھا کروں گا
اور صرف اُس کی میٹھی باتیں سنا کروں گا۔

بلوچ شعراء عموماً کبوتر، فاختہ یا کسی اور پرندے کے ذریعے اپنی محبوباؤں کو پیغام بھیجتے رہتے ہیں لیکن داستان گو نڑّی اور سُری یعنی نل بجانے والے اور اُس کے ساتھ سنگت کرنے والے گویّے کے ذریعے بھی پیغام بھیجتے ہیں۔ محبوبہ سے دُور پردیس میں پڑا ہوا عاشق کہتا ہے:۔

دستاں بند۔ سلاماں دے، بُرزو بارگیں نڑی ءُ
من و تئی گندگ دراڑ ئے من پہ تو بستگاں بارٹ ءَ

منڈءِ صُورتی مِن دیم، بلی دا تنگوءِ جھالءِ

دانی، ایدم ءِ چاکءِ، من ءَ سوگہ گُشتہ کاران

نہ جکتنت رو چ پہ وا جے، کہ دوست ءِ بانگُرءِ داران

نہ گِنتوں گُلمیت آ جو، نوا، رنجا کنہت یاران

من ءَ کہنی دل ءِ دوست اِنت، ہمے دستان ءِ سینگاران۔

یعنی)

(اے زُہی اُرسُری) جاؤ اور ہاتھ جوڑ کر

اُس بلند قامت اور نازک اندام محبُوبہ کو

میرے سلام پہنچا دو۔

اور اُس سے کہو کہ اے محبُوبہ!

گو کہ میں دیدار کے لئے بیتاب ہُوں

مگر کیا کروں کہ

تیرے پاس آنے کی کوئی صُورت نہیں۔

اے حسین لڑکی!

اگرچہ تیرا خوبصُورت چہرہ

چاند کی طرح میرے سامنے دمکتا رہتا ہے

مگر کیا کروں کہ

کام کاج نے مجھے اب تک جکڑ رکھا ہے۔

لیکن، یہ دن ہمیشہ نہیں رہیں گے۔

کبھی تو مجھے موقع ملے گا

اور میں تم کو اپنی آغوش میں لینے کے لئے

Scanned with CamScanner

وہاں آجاؤں گا۔

اے یارو!

ملک الموت کسی کو معاف نہیں کرتا

ایسا نہ ہو کہ تم

اپنی محبوباؤں کو ناراض کردو۔

میری کبوتری

مجھے دل وجان سے پیاری ہے

اس لئے تو میں اُس کی تعریف میں

یہ داستان سجاتا ہوں۔

داستانک عوامی زبان میں روئیدادِ عشق کا ایک مختصر اور سادہ بیان ہوتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی داستان گو کی زبان پر بہت عمدہ مصرعے بھی چڑھ جاتے ہیں اور ایک اچھی نظم تخلیق ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اس داستان کا خالق کہتا ہے:ـ

دِلڑی بنوی پُربستہ

بُرزروّت گنگرءِ گٹ بی

جہل ءَ ماں کنیت پھلیان

تر سنت ڈُوبرءَ لوزینی۔

بیلی تئی گندگءِ رانزینان

جگر من دلءِ گوانزینان۔

بانکھی کھندگ وچڑیان

من ءَ گشتہ ہر دوئیں شوقیان۔

سیر مگاں مجن سیاہینان

ناڈراہ کنے دُراھینان۔
جیڑیاں کناں ہرداے
روچے بان ترا گورَ باے۔
ہیلاں، گھکراں بوریںنان
گر دِی مرڈُمان دورینان
ڈالاں ٹھمرو جیڑ بنان
بھاگیاں مزن لیٹ نیان
کاچھوءِ کپوُرکیں گوکان
مِیلاءِ دپءِ ڈاچیان۔
یعنی:
میرا دل (پانی کے) بند کی طرح بھر گیا ہے
اُوپر چڑھتا ہے
تو گلے میں پھنس جاتا ہے۔
اگر نیچے اُترتا ہے
تو میری پسلیوں سے ٹکراتا ہے۔
ڈرتا ہوں کہ کہیں
میری چھاتی کو نہ توڑ دے۔
اے محبوبہ! تیرے دیدار کے لئے
مَیں اپنے دل پر کیسے کیسے وار سہتا ہوں۔
تیری صبح جیسی ہنسی
اور تیری پیار بھری دِل لگی

تیرے اِن دونوں لاڈلوں نے
مجھے مار ڈالا ہے۔
تم اپنی آنکھوں میں سُرمہ نہ لگاؤ
تندرستوں کو بیمار کر دوگی۔
تیری سہیلیوں سے میں ایک عرض کروں گا
کہ مجھے ایک دِن
تیرے ساتھ ایک گھڑی گذارنے کا موقع دیں۔
میں اِس انتظار میں ہُوں
کہ کب یہ بادل پھٹ جائیں
اور میں اُن دور کی نازنینوں
اُن بنی ٹھنی اٹھلاتی پھرتی عورتوں
اور اُن بڑے مالداروں کے خیموں کو دیکھوں
(جہاں میری محبوبہ رہتی ہے)
اونچی کی اُن سفید گائیوں کو
اور درہ مُولہ کے دہانے پر چرنے والی
اُن اونٹنیوں کو دیکھوں
(جو اُس کی ملکیت ہیں)۔

عشق و عاشقی کے بیسیوں بیان داستانوں میں ملتے ہیں
جو بلوچوں کے خانہ بدوش معاشرہ کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر

ـہ بھیڑ بکریاں پالنے والے۔ ا

Scanned with CamScanner

یہ دستان ملاحظہ ہو، دستان گو، گویّے سے کہتا ہے :ے

ڈومب ءِ چورو ءُ پلّے دَے

بروت مے دِلبرءِ حال ءَ دنت۔

ترا مال ءَ دا، بُزّ و میشّان ءَ

بندیں لیٹڑدان نیشّیان

صد میش میگڑھ ءِ جیڑیان

پنجاہ گورز پڑ ءَ ہندیان

بلی کتّیت منی کھنداں ءَ

سوتیں ہمراں ٹِلّان ءَ۔

یعنی،

اے گویّا !

ڈوم کے چھوکرے کو ایک چوَنّی دیدے

کہ جاکر میری محبوبہ کو اطلاع دے۔

"مَیں تم کو

مال میں بھیڑ بکریاں بہت دوں گا۔

ایک سو بھیڑیں

تیری سہیلیوں کو دُوں گا

اور پچاس بھیڑیں

اُن لوگوں کو بھی جو (تیرے ساتھ)

اُس میدان میں مُقیم ہیں"۔

کیا، دیکھتا ہوں کہ میری محبوبہ

اپنی سہیلیوں کے ساتھ
ہنستی کودتی اور اٹھلاتی ہوئی
میری طرف آرہی ہے۔

Scanned with CamScanner

(۱۰)

ڈیہی کے بیان میں

ڈیہی بھی داستانگ کی طرح ایک ایسا لوک گیت یا عوامی شاعری ہے جس میں عشقیہ جذبات کا اظہار ہوتا ہے البتہ ڈیہی اور داستان میں ترکیب و بندش کا فرق نمایاں ہے۔ داستانگ نڑ[1] اور سرود کے ساتھ گائی جاتی ہے لیکن ڈیہی گانے کے لئے کوئی ایک ساز مخصوص نہیں۔ دنبورہ سرود اور بسا اوقات رباب اور یکتارے کے ساتھ بھی گائی جاتی ہے۔ داستانگ کے لئے مصرعوں یا ابیات کی کوئی خاص تعداد مقرر نہیں۔ مختصر سے مختصر اور طویل سے طویل نظمیں داستانگ کے طرز یا زہیر میں گائی جاتی ہیں لیکن ڈیہی عموماً دو بیتوں کی ہوتی ہے جن میں سے پہلا بیت مورد کی طرح خالی یا مہمل ہوتا ہے لیکن دوسرا بامعنی اور بامقصد ہوتا ہے لیکن یہ بھی قاعدہ کلیہ نہیں۔ موزوں طبیعت رکھنے والے نوجوان دونوں بیتوں کو ایک شعر کی طرح جوڑ بھی دیتے ہیں بلکہ کبھی کبھی ان کے جوڑنے سے ایک مختصر سی نظم تخلیق ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ذیل کی ڈیہی ملاحظہ ہو، جس میں عاشق اپنی معشوقہ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے: ؎

نُزانی دیم ءَ جی باتی
اطلس دِپیتاں پوشاتی
نُو لکھیں جیگ ءَ دو چاتی

---

[1] بانسری کی ایک قسم

شکل وشیراں نوں شاتی

مینے تاں حیاتی پیہرمے

چھانی دیماشہ دیر مے

یعنی

اس کے نورانی چہرے کو جی ہو

ہمیشہ اطلس اور پٹ وار ریشم کے کپڑے پہنا کرے

اپنے گریبان پر

نو لاکھ کی قیمت کے بیل بوٹے کاڑھا کرے

ہمیشہ دودھ شکر پیا کرے

خدا کرے کہ جب تک میں زندہ رہوں

وہ بوڑھی نہ ہو

اور کبھی میری آنکھوں کے سامنے سے

دور نہ ہو۔

اسی طرح یہ ڈیہی طویل ہوتی اور پھیلتی جاتی ہے۔ موزوں طبع نوجوان اس میں بند پہ بند بڑھاتے جاتے ہیں جیسا کہ اے

گوری تی تکلیں چھانی

ور دکھا صورت دی کھانی

زمیں چھیتی پیا جانی!

حق دے سر دی چم چیر مے

چھانی دیماشہ دیرمے

یعنی

Scanned with CamScanner

تیری کاجل بھری آنکھوں کے میں قربان

تھوڑی دیر کے لئے بھی

اگر میں تم کو نہ دیکھوں

تو مجھے ڈر لگتا ہے،

اے جانی ! آجاؤ

خدا کے لئے میری آنکھوں سے اوجھل مت ہو

کبھی میری آنکھوں کے سامنے سے

دُور نہ ہو۔

اسی طرز کی ایک اور ڈیہی ملاحظہ ہو جس میں مصرعِ ثانی کا تکرار نغمۂ آب کیطرح ایک ترنم پیدا کرتا ہے :-

جتنی مچھل گدی   درکپ بیادرءَ
ہرانی بانہرءَ   درکپ بیادرءَ
دوست ءِ دتی گندگءَ   درکپ بیادرءَ
ہرانی چارگءَ   درکپ بیادرءَ
کاڈانی ہمسرءَ   درکپ بیادرءَ
لیبانی موسم انت،   درکپ بیادرءَ
جتنی سھور گدی   درکپ بیادرءَ
نگرھیں دروشم ءِ   درکپ بیادرءَ

یعنی:

اے جتنی، پھولدار دوپٹے والی !   گھر سے نکل کر باہر آجا،
اونٹنیوں کے بچوں کے باڑے میں   گھر سے نکل کر باہر آجا

اپنے دوست سے ملنے کے لئے — گھر سے نکل کر باہر آجا
اُدنٹیوں کے بچوں کو دیکھنے کے لئے — گھر سے نکل کر باہر آجا
اپنی ہم سن عورتوں کے ساتھ — گھر سے نکل کر باہر آجا
کھیل کود کا موسم ہے — گھر سے نکل کر باہر آجا
اے بھتیجی ، لال دوپٹے والی ! — گھر سے نکل کر باہر آجا
اپنا چاندی جیسا مکھڑا دکھانے کو — گھر سے نکل کر باہر آجا

ڈیہی بلوچی عشقیہ شاعری کا ایک ہر دلعزیز، مقبولِ عام اور دلنشین اندازِ بیان ہے۔ مرد اور عورتیں یکساں ڈیہی گاتے اور گرہ لگاتے جاتے ہیں۔ ڈیہی کا آسان اور مقبولِ عام طرز دو بیتوں کا ہے جس میں ایک مہمل اور دُوسرا بامعنی اور بامقصد ہوتا ہے۔ ڈیہی کے اپنے مخصوص زہیر یا نغمے ہوتے ہیں۔ ان کو ہم ڈیہی کے بہر اور اوزان بھی کہہ سکتے ہیں۔ ذیل میں ہم ڈیہی کے کچھ پسندیدہ زہیر پیش کرتے ہیں جو ہمارے تکمیلِ کار پر منتج ہوں گے۔ موہڈا ہے

(۱)

(۱) چھیتیں پشکے یہ وتی جاری
عشق ءَ ہما کنت درداں واری

(۲) سبز بِن کہنی دل تئی گوہے
بیار کِتاباں کتی دل ءَ ڈوہے

(۳) سبز ءِ لوگ ءَ بُجگیں یونا
چم تئی رلیفل مئی کنئے حون ءَ

(۴) چُھٹی گپتہ رُوگاں ہپیر ءَ
سبز ءِ خیال مارا جنگیں تیر ءَ

یعنی :

(۱) وہ اپنے لئے چھینٹ کا پیراہن سیتی ہے
عشق تو وہی کر سکتا ہے جس کے دل میں درد ہو۔

(۲) اے سبز کبوتر (محبوبہ) تیرا دل پتھر کا ہے
کتابیں لے آ، اور دیکھ لے کہ قصور کس کا ہے۔

(۳) اُس سبز (پری) کے گھر میں گراموفون بج رہا ہے
اے محبوبہ! تیری آنکھیں رائفل کی طرح ہیں
تم ہمارا خون کر دو گی۔

(۴) میں نے رخصت لی ہے
پیر صاحب کی زیارت کو جا رہا ہوں
سبز (پری) کی یاد
مجھے تیر مارتی ہے۔

۲

(۱) بیا منی زیبا! من ترا گندان
پرتہ زہیراں یکدے ہنداں

(۲) بڑ دے سلام ءُ، گپتگاں دام ءُ
گرداں، ہنداں، گراں تئی نام ءُ

(۳) مہری ءِ داجہ، تئی مہری زردِ ل،
دروگگیں ہندے، بنی زیبا کرد ن۔

(۴) زہیراں پہ دوست ءِ ، چماں کوراں
باوَر بیارے کہ داشتگنت زوراں

(۵) لَڈّتہ گُونجاں سائے بیتہ
جی شُمے چماں ، دوست ءَ دیتہ

(۶) لیلیں پتنکے ، دامُن ءِ جیگھاں
کڑ وکُتہ دوست ءِ ، کپتگاں سیگاں

(۷) چیتّی ءِ لاپ ءَ ، لکھاں حالاں
روچ گوزان تنت ، پتاسالاں

(۸) سوالے ہیش انت عرش ءِ جناب ءَ
مُولا ! بیار مئے پھلّ گلاب ءَ

(۹) آھاڑہ روچنت ، گرم لوابِن
دِڑّی مُھتکہ ، زردول کبابِن

(۱۰) گنداں ترا ، دِل باگھ و بہارِن
اُش تو ہوا دِل سیاہ و تہارِن۔

(یعنی)

(۱) اے حسینہ ! آکہ میں تیرا دیدار کرلوں
میں تیرے لئے تڑپ رہا ہوں

آ کہ تھوڑی دیر مل کر بیٹھیں۔

(۲) میرے سلام لے جا کر، اُسے پہنچا دو
میں تیری یادوں کے دام میں پھنس گیا ہُوں
چلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے تیرا ہی نام جپتا ہُوں۔

(۳) اے سانڈنی کی مالکن
تیری سانڈنی زرد رنگ کی ہے
یہ عید جھوٹی ہے
جبکہ وہ حسینہ ہم سے بچھڑ گئی ہے۔

(۴) دوست کے فراق میں، آنکھوں سے اندھا ہو چکا ہوں
یقین کر لو کہ مجھے زبردستوں نے روک لیا ہے۔

(۵) اے کُونجو ! ایک سال ہُوا کہ
وہ یہاں سے لد کر گئی ہے۔
تمہاری آنکھوں کے قُربان
کہ تم نے اُسے دیکھا ہے۔

(۶) میری دوست ، وہاں بیٹھ کر
اپنے ململ کے پیراہن کے گریبان پہ
گلشبو کاری کر رہی ہے۔
اور میں یہاں بیٹھا
اُس کی جدائی کا ماتم کر رہا ہُوں۔

(۷) خط میں اُس کو
میں اپنا حال لکھتا ہوں
دن جو گذرتے ہیں
وہ میرے لئے سال کے برابر ہوتے ہیں۔

(۸) عرش کے (مالک کے) سامنے میرا سوال پیش ہے،
اے مولا !
میرے گلاب کے پھول کو واپس لے آ۔

(۹) گرمیوں کے دن ہیں اور لُو چلتی ہے
(فراقِ یار میں)
میرا دل جل کر کباب ہو گیا ہے۔

(۱۰) جب تم کو دیکھتا ہوں
تو میرا دِل باغ و بہار ہوتا ہے
تیرے بغیر
دل پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔

(۳)

(۱) لیٔبانی لتیمبی
تی ہمند ءِ کے گی

(۲) کوہانی مُیشران
مِنت دمیُران

Scanned with CamScanner

(۲) بیامنی موبل ، ترا ساہ ءَ داران
دوست ءَ ، ہزاران پہجبہّ کاران

(۳) تو کہ رَوَگئے ، من تراچے شان
تئی جھولی نیام ءَ ارساں ریشان

(۴) چم تئی بیبر مگ ، دپ تئی مُسا گن
زی تئیں لگہ تئی ، جان ءَ منی داگن۔

یعنی

(۱) اے لاڈوں والی ، بُلند قامت محبوبہ !
تم بیشک حسین ہو
مگر ، لوگ کہتے ہیں کہ
مطلب پرست بھی ہو۔

(۲) اے میری پیاری آجاؤ ! کہ
مَیں تم کو اپنے سینے سے لگاؤں
مَیں تم کو ہزاروں میں پہچان لیتا ہوں۔

(۳) تم جا رہی ہو ، مَیں تم کو کیا کہوں
(سوائے اِس کے کہ
چند قطرے آنسوؤں کے
تیری جھولی میں گرا دوں۔

(۴) تیری آنکھوں میں سُرمہ
اور تیرے ہونٹوں پہ دنداسہ مَلا ہُوا ہے
کل کا تیرا گِلہ
میرے دِل پہ داغ ہو گیا ہے۔

(۶)

(۱) جھرکیاں جھارن
دُکھی مے گارن

(۲) تو رُدے ہند ء
بیایے منی ہند ء

(۳) گُدتی تھارن،
ٹِنگ تی شانن

(۴) گندِیانی رونن
دوست من ءُ گونن۔

یعنی،

(۱) چڑیاں شور مچا رہی ہیں
ہمیں دُکھ دینے والی لگتی ہے۔

(۲) تم جب پیدل جاؤ گی
تو ہمارے ہاں سے ہو کر جانا۔

Scanned with CamScanner

(۳) تیرا دوپٹہ کتان کا ہے
اور اٹھلاتے پھرنا تیری شان ہے۔

(۴) گندم کی فصل کٹ رہی ہے
میرا دوست میرے ساتھ ہے۔

(۷)

(۱) اَنگلگاں دِ بِرہ ءَ
کوراں زہیرہ ءَ

(۲) کوہانی سیسی
وَتڑاں پر دیسی

(۳) مُندری تئی ہمند ءَ
دوستیں، تئی رَند ءَ

(۴) ڈِیل ءَ تئی گہنداں
بے گمی ءَ ہنداں

(۵) آس مں دِل ءَ اِنت
دھاں گوں خدا اِنت

(۶) ہنجانی ٹولے
وُرشں، تئی بولی

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner